سنگیت کار

ایوب اولیاء

مجھے شکل دے کے تمام کر کفِ کوزہ گر
کبھی کو بکو مجھے عام کر کفِ کوزہ گر

ممتاز اطہر

سنگیت کار

ایوب اولیاء

ادب عالیہ پبلی کیشنز

711-کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

0321-7730040/0333-6414947

riazhans@yahoo.com

باذوق لوگوں کے لیے

ہماری کتابیں، خوبصورت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

ریاض ہانس

ضابطہ

کتاب	سنگیت کار
مصنف	ایوب اولیاء
ٹائٹل	احسن گل
کمپوزنگ	التمش مبین
اشاعت	جنوری 2017
اہتمام	ذیشان شاہد
ناشر	ادب عالیہ پبلی کیشنز
طابع	حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
قیمت	-/400روپے

ادب عالیہ پبلی کیشنز

711-کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

0321-7730040/0333-6414947

riazhans@yahoo.com

انتساب

والدہ مرحومہ آمنہ بیگم صاحبہ

اور

اہلیہ خورشید بیگم اولیاء

کے نام

کہو رفتگاں یہ مقام کیسا مقام ہے
یہاں ہر کسی کو نگلتے جاتے ہیں راستے

آصف ہمایوں

فہرست

سُر کی منزل کا مسافر.....ایوب اولیاء	9
ایوب اولیاء مشاہیر کی نظر میں	15
عرضِ مصنف	20
گائیکی کا تدریجی ارتقاء	21
غالب اور موسیقی	27
استاد عاشق علی خان	45
اُستاد بڑے غلام علی خان	54
امیر خان صاحب.....امیرِ موسیقی	59
استاد برکت علی خان	65
استاد منور علی خاں	73
استاد نزاکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں	77
ملکۂ موسیقی، روشن آرا بیگم	81

8

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو	83
صدائے رفتہ.....مختار بیگم	88
بنارسی مغنیہ.....رسولن بائی	94
امر سہگل.....کندن لال سہگل	103
فریدہ خانم	109
صوفی خدا بخش.....عطائی گویا	113
ناہید نیازی	121
رفیق غزنوی مرحوم	126
ماسٹر جھنڈے خان	131
پنڈت روی شنکر (ستار نواز)	139
اُستاد نتھو خاں مرحوم	143
چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی ہے ضرور	147

سُر کی منزل کا مسافر ــــ ایوب اولیاء

میری شاعری کا آغاز تو بہت پہلے ہو گیا تھا لیکن میں نے جب ایمرسن کالج سے گریجوایشن کرنے کے بعد ایف سی کالج میں داخلہ لیا تو شاعری مجھ پہ بارش کی طرح برسنے لگی۔ میرے ترنم اور شاعری کی بدولت کالج کی حد تک ایک حلقہ تعارف پیدا ہو گیا جس میں سب سے اہم شخصیت محمد ایوب اولیا کی تھی، جو تھرڈ ایئر کے طالب علم تھے اور نیوٹن ہال کے کمرہ نمبر 3 میں رہتے تھے۔ جبکہ میں ایم اے (انگلش) کے سالِ اوّل کا طالب علم تھا اور گرسولڈ ہال میں کمرہ نمبر ۶۷ میں رہتا تھا جو دراصل ڈارمیٹری تھی اور اس میں میرے رفیق اقامت جمیل گشکوری تھے جو خاصے موزوں طبع تھے اور گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں میں پروفیسر جیلانی کامران کے شاگرد رہے تھے۔ جیلانی کامران کی جدید طرز اور جدید طرزِ احساس کی نظموں کا مجموعہ ''استانزے'' اسی عرصے میں شائع ہو کر معروف ہو چکا تھا۔ جمیل گشکوری کو اس مجموعے کی اکثر نظمیں زبانی یاد تھیں جو میں ان سے سنا کرتا تھا۔ ایوب اولیاء اگرچہ جونیئر کلاس کے طالب علم تھے تاہم ان کا رکھ رکھاؤ اور متانت آمیز سبھاؤ سینئرز کو بھی مات کرتا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت جو مجھے متاثر کرتی تھی، ان کا رچا ہوا ادبی ذوق اور ذہنی پختگی تھی جو میرے لیے قابلِ رشک تھی۔ وہ مولانا عبدالمجید سالک سے ملتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ اکثر ادبی شخصیات سے وابستہ روایات سے واقف تھے۔ اسی زمانے میں میں نے بھی فراق گورکھپوری کو ان کے مجموعہ کلام ''شعلہ ساز'' کے ذریعے دریافت کیا تھا

اور ایوب اولیاء بھی فراق کی شاعری اور ان کی شخصیت سے آگاہ تھے۔ فراقؔ کی ایک تضمین مجھے انہیں نے سنائی:

میں کس کو مخاطب کروں رسوائی میں
اے صبا این ہمہ آوردۂ تست

یگانہ کی تصویر اور اس کا یہ شعر اگرچہ میں ''نقوش'' کے کسی نمبر میں دیکھ چکا تھا لیکن ایوب اولیا کی زبانی سن کر اس شعر نے مزہ دیا:

کرشن کا ہوں پجاری، علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

میرے اور ایوب اولیا کے درمیان ادبی ذوق کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی مشترک تھیں۔ مثلاً مشاہیر علم وفن سے ملاقات کا شوق، موسیقی اور خاص طور پر کلاسیکی موسیقی کا ذوق اور مخصوص دوستوں کے ساتھ صحبت گرم کرنے کا میلان..... میرے اور ان کے درمیان قربت کا باعث تھا۔ اتفاق سے میں بچپن ہی سے چغتائی کی تصویریں دیکھتا آیا تھا۔ ''نقش چغتائی'' بچپن ہی سے میری دسترس میں آ گیا تھا۔ بی اے میں ''مرقع چغتائی'' مجھے پرائز بکس میں کیا ملا کہ مجھ پر جمالیاتی احساس وادراک کے نئے در وا ہو گئے۔ میں نے اپنی کسی تحریر میں مرقع چغتائی کے حوالے سے اپنے ''استغراقی مطالعات کا'' کا ذکر کیا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ بات کیسے ہمارے علم میں آئی کہ چغتائی راوی روڈ پر رہتے ہیں۔ چغتائی کے ایک بھائی عبدالرحیم کا ذکر بھی آیا جو چغتائی سے ملنے کا اشتیاق رکھنے والوں کے لیے ''دور باش'' کا حکم رکھتے تھے۔ ان باتوں کا ذکر میرے اور ایوب اولیاء کے درمیان اکثر رہتا تھا۔ ایک دن نہ جانے ہمارے جی میں کیا آئی کہ ہم چغتائی کی ملاقات کو نکل کھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھ جونیئر کلاس کا ایک اور لڑکا بھی تھا جو اَب یاد نہیں کہ کون تھا۔ یہ بھی یاد نہیں کہ ہم

راوی روڈ تک کیسے جا پہنچے۔ معلوم ہوا کہ چغتائی صاحب تیسری منزل پر رہتے ہیں۔ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے ساتھ ہی Door Bell کا سوئچ تھا۔ جسے دبانے پر اوپر سے کسی نے پوچھا ''کون؟'' ہم میں سے کسی نے کہا ''ہم چغتائی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں'' پوچھا گیا ''آپ کون ہیں؟'' اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اور جواب دیتا ایوب اولیاء نے موقعہ شناسی اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے کہا ''ہم امریکن کالج سے آئے ہیں'' یہ جملہ ''کھل جا سم سم'' کا کام کر گیا اور ہمیں اوپر بلا لیا گیا۔ ہمیں ایک چھوٹے سے ملاقاتی کمرے میں بٹھایا گیا۔ چغتائی صاحب کا اسٹوڈیو جس کو دور سے دیکھنے کی بھی کسی کو اجازت نہ تھی، ملاقاتی کمرے سے صاف نظر آ رہا تھا۔ چغتائی صاحب نے ہمیں اپنی بہت سی زیرِ تکمیل تصویریں دکھائیں اور ان پر تبصرہ بھی کرتے گئے۔ شاید ان کی ''واش ٹیکنیک'' کا ذکر بھی ہوا۔ غالباً ایوب اولیاء نے کہا کہ ''سنا ہے آپ کسی کو سکھاتے نہیں'' اس پر چغتائی صاحب نے کہا کہ کسی کو سیکھنے کا شوق اور حوصلہ ہی نہیں۔ اصل میں ہمارے ہاں دو سال تک تو سیاہی (روشنائی) بنانا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈرائنگ اور رنگوں کی باری آتی ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ہم نے ایک لڑکے کو سیاہی بنانا سکھانا شروع کیا تھا لیکن کچھ ہی دنوں میں وہ بھاگ گیا۔ اسی دوران ہمارے لیے پھل بھی منگوائے گئے جن میں سرخ سیب نمایاں تھے جو بارہ تیرہ برس کی ایک بچی نے Serve کیے۔ مزید باتیں ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔ شاید دورانِ ملاقات چغتائی صاحب کے بھائی عبدالرحیم نے بھی صورت دکھائی۔ غرض یوں ہم نے مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی سے مل کر بڑا معرکہ سر کیا۔

بعد میں جب کبھی ان کی سیاہی بنانے والی بات یاد آئی تو حیرت ہوئی کہ چغتائی صاحب کی تصاویر میں تو سائے تک کا گزر نہیں، خواہ انسانی پیکر ہوں، درخت ہوں یا ٹھوس اشیاء، کسی کا سایہ نہیں ہوتا۔ سیاہی ان کے کس کام آتی ہوگی؟؟

اسی طرح ایک روز ہم نے فریدہ خانم کی سفید رنگ کی کوٹھی کو بھی قریب سے جا کر دیکھا۔ اس وقت تک ایوب اولیاء کے فریدہ خانم سے مراسم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح کے معرکے ایوب اولیاء نے بعد میں سر کیے اور بڑے بڑے استادگائکوں سے مراسم استوار کیے۔ لندن جا کر انھوں نے استاد اللہ رکھا خاں سے بھی مراسم بڑھائے۔ خان صاحب کے ساتھ ان کا رشتہ مصاہرۃ پر منتج ہوا اور یوں ان کو وہ منزل بھی ملی جس کے خواب ہر نوجوان دیکھا کرتا ہے۔ منزل بھی ملی اور ایک کامیاب اور کامگار زندگی کا آغاز ہوا۔ جو دیارِ غیر میں ان کے مستقل قیام کا باعث بھی ہوا اور پی آئی اے کے کیریئر کے آغاز کا سبب بھی بنا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رفتہ رفتہ ان کی توجہ موسیقی کے بڑے ناموں کی طرف زیادہ ہوتی گئی۔ مختار بیگم پر مضمون انھوں نے اسی زمانے میں ہی لکھ لیا تھا جس کا اوپر کی سطور میں ذکر ہوا۔ ایوب اولیاء صاحب کی عادت دیرینہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک ہی بار میں لکھتے ہیں۔ ہر جملہ جچا تلا ہوتا ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ روش بھی ان کی شخصیت کی پختگی کو ظاہر کرتی ہے اور خود اعتمادی کو بھی جو ذوق کی پختگی کی وجہ سے بے بنیاد بھی نہیں۔ مختار بیگم والا مضمون میں نے اسی زمانے میں دیکھا تھا۔ میں نے اس کی اشاعت پر بہت زور دیا لیکن معلوم نہیں وہ کب چھپا۔ اب موجودہ صورت میں اس کو پڑھنے کا موقع ملا۔ دیکھا جائے تو ایوب اولیا بنیادی طور پر ایک اچھے خاکہ نگار ہیں جو شخصیتوں کے بھید کھولنے کا گُر جانتے ہیں۔ زبان ان کی ایسی معیاری ہے کہ سبحان اللہ۔ پنجاب میں بیٹھے ہوئے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مزہ لیجیے۔ اب یہی دیکھیے کہ انھوں نے کس کس طرح سے اپنے پسندیدہ اربابِ فن کے بعض شخصی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ سرنگیت کے معاملے میں اُن کی سوجھ بوجھ اُن کے ہر جملے سے واضح ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"قلم اس غیرتِ ناہید کا داستاں طراز ہو رہا ہے جو برسوں آغا حشر

مرحوم کی ہم دم و دم ساز رہیں۔ آغا حشر نے ان سے عورت کے احساسات و جذبات کی عکاسی سیکھی اور انھوں نے آغا حشر جیسے عظیم فن کار کو سمجھا اور فن کو صیقل کرنے میں ممد و معاون ہوئیں۔ زندگی کو دونوں نے ایک ہی زاویۂ نظر سے دیکھا اور عمروں کا تفاوت ذوق کی اکائی کو نہ دبا سکا۔'' (صدائے رفتہ، مختار بیگم)

''گائیکی کے متوالوں کو قصوریوں نے لوٹ لیا ہے۔ آواز کے ایک ہی وار سے گھایل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سریلا پن اور سنگیت کی شیرینی قصور کے گویوں پر ختم ہے۔''

''برکت علی خاں ٹھمریوں کو اپنے مخصوص نرم و نازک لہجے میں ادا کرتے ہیں تو ان میں گویا روح ڈال دیتے ہیں۔ ہولے ہولے سروں میں وہ صوت و آہنگ سے ایسے ایسے گل بوٹے بناتے ہیں کہ سننے والا ششدر رہ جاتا ہے۔ خان صاحب دھیرے دھیرے ہارمونیم میں ہوا بھرتے جاتے ہیں۔ اُن کی بھاری انگلیاں سروں پر مچلتی ہیں۔ ساتھ ہی گلے کا نور لپکتا ہے اور ساز و آواز کا یہ امتزاج ایک حسین و دلکش مرقع موسیقی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے جس میں برکت علی خان کی روح، شخصیت اور فن مدغم ہوتا ہے۔''

(استاد برکت علی خاں)

محمد ایوب اولیا نے ان مضامین کے ذریعے کلاسیکی موسیقی اور غزل کی گائیکی کے ایک روشن اور درخشاں عہد کو زندہ کر دیا ہے۔ ان شخصی خاکوں میں انھوں نے ایسے دلکش اور خوبصورت رنگ بھر دیے ہیں کہ فی الحقیقت ایک ''مرقع سنگیت'' وجود میں آ گیا ہے۔ ان کا

دل نشیں طرزِ بیان اور ان کے اسلوب کی اہمیت اُنھیں ادب میں امتیازی مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانۂ طالب علمی کی دوستیاں ایسی بے لوث اور بے ریا ہوتی ہیں کہ عمروں کے زمانی اور مکانی فاصلے بھی ان کی لو کو مدھم نہیں کر پاتے۔ محمد ایوب اولیا اور اس خاکسار کے ربط دوستی کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مئی ۱۹۶۰ء میں ہونے والی آخری ملاقات کے بعد میری اُن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس سارے عرصے میں ہم کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کے بارے میں باخبر رہے ہیں اور کبھی کبھی فون پر بات بھی ہو جاتی ہے۔ گزشتہ سال انھوں نے مجھے ایک خط بھی لکھا۔ جس کا جواب مجھ سے نہ بن پایا۔ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے لاہور سے فون کیا اور جس بے تکلفی سے بات کی، اس نے پرانی یادوں کو تازہ کر دیا۔ اب جب اُن کی تحریروں کو دیکھا تو گویا ان سے ذہنی ملاقات بھی کر لی اور عہد رفتہ کو بھی یاد کر لیا۔ میں اپنی طرف سے اُن کے اس مجموعہ مضامین کا خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ اربابِ ذوقِ نظر کے حلقوں میں پذیرائی حاصل کرے۔ جس کا مجھے یقین بھی ہے!

ڈاکٹر اسلم انصاری

ایوب اولیاء مشاہیر کی نظر میں

جب میں دیکھتا ہوں کہ ایوب اولیا کلاسیکی موسیقی کے رسیا ہیں اور اس گئے گزرے دور میں بھی کلاسیکی موسیقی کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں تو ان کے ذوق اور پامردی پر مسرت بخش حیرت ہوتی ہے۔ کلاسیکل موسیقی کے ساتھ اس وابستگی نے ان کے مزاج و کردار پر بھی مثبت اثرات ڈالے ہیں بلکہ فنون لطیفہ کی کردار سازی کی مثال کے طور میں ایوب اولیاء کا نام پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

ایوب اولیاء سے میری ملاقات تقریباً بائیس برس پہلے لندن میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بھی، جب دوستوں کی زیادہ تر مصروفیات خوش وقتی کے خانے میں شمار ہوتی تھیں، ایوب اولیاء سنجیدگی سے شعر اور موسیقی کی دھن میں رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی ادب اور موسیقی میں تفریق نہ کی تھی اور شعر کو الفاظ و معنی سے زیادہ لحن کی صورت میں سنتے اور جذب کرتے تھے۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، باقی چیزوں سے ہٹ کر، موسیقی کے ساتھ ان کی لگن گہری ہوتی گئی۔

آج ایوب اولیاء کے اس بیس سالہ 'ریاض' ہی کا نتیجہ ہے کہ ہماری موسیقی کے بارے میں ان کا علم عمیق اور لاجواب ہے۔

عبداللہ حسین

اردو ادب میں چند ہی شعراء ہیں جو سنگیت، اس کے سر، لے، اتار چڑھاؤ، پیچیدگیوں اور باریکیوں سے واقف ہیں۔ لیکن ایوب اولیا کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ سنگیت کا پورا سنسار، اس کی شخصیت میں رچ بس گیا ہے کہ اس کے ہر مضمون سے وسیع مطالعہ، پختہ شعور اور گہرے گیان کا احساس ہوتا ہے۔ سنگیت کو تحریری لباس پہنانا بڑا مشکل فن ہے۔ لیکن ایوب نے اس فن پر فتح پائی ہے۔

جیتندر بلو

لندن، ۱۹۹۲ء

(خط سے اقتباس)

جناب محمد ایوب اولیاء صاحب!

السلام علیکم آپ کا محبت سے بھرپور خط ملا۔ پڑھ کر از حد خوشی ہوئی.....

.....آپ کو خود ہی معلوم ہے کہ میں ہمیشہ مغرب کے سنگیت پر کچھ نہ کچھ کہتا رہا ہوں، وہ آپ کو خود معلوم ہے کہ ہماری فلموں میں بدیسی سنگیت کی بے حد نقل کی جا رہی ہے جو کہ مجھے پسند نہیں۔ میں اکیلا اس کے خلاف برسوں سے آواز اٹھاتا رہا ہوں۔ یہ آپ خود مضمون بنا کر لکھ دیں، آپ تو بہت قابل اور موسیقی کے بارے میں بڑی جانکاری رکھتے ہیں۔

نوشاد علی

(ایک خط سے اقتباس)

محترم جناب محمد ایوب اولیاء صاحب، سلام مسنون

.....ان دنوں میری سوانح حیات لکھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اسی سلسلے میں سالہا سال کے جمع شدہ دستاویزات، خطوط اور متفرق کاغذات کی پڑتال ہو رہی ہے..... مذکورہ کاغذات میں آپ کا..... تحریر کردہ گرامی نامہ ملا ہے۔ جسے اس تالیف میں شامل کرنے کا ارادہ ہے، تاکہ آپ جیسے صحیح فن شناسوں کی یاد باقی رہے.....

روشن آراء بیگم

میں نے ساٹھ کی دھائی میں موسیقی پر ایوب اولیاء کے دو مضامین پڑھے تھے۔ سم، سر، ال، کھرج، گندھار، اُتم، پنچم اور موسیقی کے مختلف گھرانوں سے ان کی آگاہی نے بہت متاثر کیا تھا۔ جہاں بھی ان کی تحریریں نظر آتی ہیں، استفادہ ضرور کرتا ہوں۔ اب ان کی کتاب آ رہی ہے۔ خدا کرے کہ ع

'جس پردے سے جو سُر بولے گونج اٹھے سنسار.....'

آرزو لکھنوی

ساقی فاروقی

عزیزی ایوب اولیاء کی شعر فہمی اور ادبی ذوق کا تو ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔ اب موسیقاروں پر ان کے جستہ جستہ مضامین نظر سے گزرے ہیں تو میں ان کی موسیقی سے دلچسپی سے بھی آگاہ ہو گیا ہوں۔ مجھے امید کامل ہے کہ ان کی زیر ترتیب کتاب موسیقار 'سنگیت کار' آب حیات کی طرح دلچسپی اور انہماک سے پڑھی جائے گی۔

رالف رسل

دس مارچ سن ۲۰۰۸ء

کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے کہ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے، جب میں پہلی بار ایوب اولیاء سے ملا تھا تو دنیا بالکل مختلف تھی۔ موسیقی کے حوالے سے یہ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی کا دور تھا۔ ایوب اولیاء، حیات احمد خان کی طرح پوری طرح فعال تھے۔ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کا سایہ ہم سب کے سروں پر موجود تھا۔ آج کی صورت حال یکسر مختلف ہے اور ہم پرانی وضع کے لوگوں کے لئے تو یہ واقعی future shock ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اعتراف ہے کہ میں موسیقی کے لیے رجحانات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکا۔ قصور ممکن ہے میرا اپنا ہی ہو۔ ایوب اولیاء نے موسیقی اور موسیقاروں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، میں اسے اپنے لئے گوشہ عافیت خیال کرتا ہوں۔ اُن کی تحریریں ادبی سطح پر بھی بڑی اہمیت کا کام ہے۔

ایوب اولیاء نے ادب اور موسیقی کو اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے جیسے کہ کبھی کبھی تانپورے اور گانے والے کی آواز ایک ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس روایت کو آگے بڑھانے والا بظاہر کوئی نظر نہیں آتا مگر میری دعا ہے کہ روایت زندہ رہے۔ ایوب اولیاء کی تحریریں اس سلسلے میں ضرور مددگار ہوں گی۔ خدا کرے وہ زندگی بھر اس سلسلے کو آگے بڑھاتے رہیں اور پھر یہ روایت کئی نسلوں تک بھی منتقل ہو۔

19

اک رفیق طریق صدیقی
ہے ہمہ تن فدائے موسیقی
سربسر راگ ودیا ہے وہی
شاید ایوب اولیا ہے وہی

شہزاد احمد

میں (پنڈت روی شنکر) بہت عرصے سے ایوب اولیاء کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کلاسیکی موسیقی میں اُن جیسا اشتیاق اور استغراق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے، وہ ہمارے ساتھ نیویارک، پیرس، فرینکفرٹ اور برطانیہ کے بہت سے شہروں میں ہماری موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں۔ جہاں میں نے ان کی موسیقی میں دلچسپی کو بڑے قریب سے اور بڑے غور سے مشاہدہ کیا ہے۔

اُن خاکوں کو جو انہوں نے برصغیر کے موسیقاروں اور فنکاروں پر لکھے ہیں۔ میں نے بڑا دلچسپ اور معلوماتی پایا ہے۔ انہوں نے جو کتاب ''سنگیت کار'' کے نام سے مرتب کی ہے اور اس میں ہندو پاک کے نامی فنکاروں اور سنگیت کاروں کے کام اور شخصیت پر خاکے لکھے ہیں۔ اس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ یہ کتاب موسیقی کے فن پر لکھے گئے ادب میں نمایاں اہمیت کی حامل ثابت ہوگی۔

یہ شعبۂ فن انتہائی مخصوص نوعیت کا ہے اور ایوب اولیاء بلاشبہ اس میدان میں ماہر ادیب، نہایت چابکدست اور زیرک لیکھک ہیں۔

پنڈت روی شنکر

عرضِ مصنف

کتابِ عمر ہے گویا انیس تنہائی
نظر کے سامنے ماضی و حال رہتا ہے

زندگی میں دو ہی مشغلے رہے ہیں۔ ادب و شعر اور موسیقی۔ اردو زبان کی تحصیل مڈل تک مکتبی ہے۔ اس کے بعد مطالعہ جاری رہا۔ اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھتا اور چھپواتا رہا۔ ان کی تدوین کا خیال بہت کم آیا۔ اساتذۂ ادب و موسیقی سے بالمشافہ مکالمہ ہوتا رہا۔ موسیقی کے استادوں اور دوانوں سے آشنائی ہوئی۔ ان کی محفلوں اور مجلسوں سے استفادہ کیا۔ اور ان پر مضامین لکھ کر حق رفاقت اور حق دوستی ادا کیا۔ بعضوں کو نہ مل سکا لیکن ان سے متاثر ہوا۔ اور ان کی مداحی کی اور خوب کی۔

اس خوب و ناخوب کی کشمکش میں ذہن چمکتا گیا اور دل پگھلتا گیا۔ پچھلے پچپن برس سے لندن میں مقیم ہوں۔ اس دوران برصغیر کے فن کاروں کو پیٹ بھر سنا۔ ان کو سراہا۔ ان کی ہم نشینی اور صحبت میسر ہوئی۔ زیرِ نظر مجموعے کو مدلل مداحی کہہ لیجئے کیونکہ یہ ذاتی استحسان اور تعریف ہے۔ اس لئے بعض باتوں سے آپ کو اختلاف ہوگا۔ سو وہ آپ کا بھی حق ہے۔

ہم بھی بتائیں تم کو کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

محمد ایوب اولیا

''مطربِ بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے''

گائیکی کا تدریجی ارتقاء

(ایک جائزہ)

برصغیر ہندو پاکستان کی موسیقی کی ترویج وترقی کے لئے وہاں کی تمام قوموں نے خاطر خواہ کوشش کی ہے؛ خصوصی طور پر یہ شاستری فن ہے جو ہندو پاکستان میں پچھلے تین ہزار سالوں سے مروج ہے۔ شروع شروع میں صرف تین سروں پر مشتمل اشلوک وغیرہ پڑھے جاتے تھے جیسے کہ ہمارے ہاں فقیر وغیرہ بازاروں میں پڑھتے اور گاتے ہیں۔ جوں جوں ذہن انسانی ترقی کرتا گیا۔ سروں کی تعداد بڑھتی گئی اور موسیقی کے ودوانوں نے اس کے قواعد وضوابط مرتب کرنا شروع کر دیئے راگوں کی تنظیم ہوئی اور طے پایا کہ راگ یا سکیل کے پانچ سے کم سُر نہیں ہو سکتے۔ (لغوی لحاظ سے راگ سے ایسی چیز مراد ہے جو ذہن کو رنگ وروغن سے بالیدگی بخشے) دور حاضر میں پانچ، چھ اور سات سُر کے راگوں کو گایا بجایا جاتا ہے۔ سارے گاما پادھانی۔ سات سُر بنیادی قرار پائے جن میں سا اور پا قائم سر ہیں اور باقی پانچ کے جوڑے وضع ہوئے یعنی کومل اور تیور..... اس طرح سروں کا استعمال ہونے لگا۔ اس کے علاوہ صنفِ خیال کی زیبائش کے لئے سرتیاں بھی مستعمل ہونے لگیں جن کی تعداد موسیقاروں کے نزدیک بائیس ہے۔

فن شاعری کی صنفوں۔ حمد۔ مناجات۔ قصیدہ، تشبیب اور رباعی وغیرہ کی طرح علم موسیقی میں مختلف النوع راگداری، طرحیں پڑیں یعنی دھرپد، ہوری دھمار، خیال، ترانہ، ٹھمری

وغیرہ۔

دھرپد کو منا جاتی صنف سمجھ لیجئے۔ یہ قدیم زمانے سے مندروں میں حمد یہ راگوں کے طور پر گایا جاتا تھا اور آج تک مروج ہے مگر خال خال۔ اس کے بول خالصتاً سنسکرت کے ہوتے تھے کیونکہ ہنود کی قسم تھی اور بندگی اور عبودیت کے لئے مختص تھی جس میں پاکیزہ جذبات کا اظہار خالق حقیقی کے دربار میں ہوتا تھا۔ بعد کو ہندی میں بھی دھرپد باندھے جانے لگے ہمارے ہاں ڈاگر بانی کا گھرانہ، شام چوراسی کا دھرپد یہ گھرانہ وغیرہ مشہور ہیں پاکستان میں شام چوراسی کے نمائندہ گویے نیاز حسین سے دھرپد کی ایک آدھ چیز سنائی دے جاتی ہے۔ (حال ہی میں صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔

رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

درحقیقت یہ صنف موسیقی ناپید بلکہ متروک ہوتی جاتی ہے سرسیدھے اور صاف لگائے جاتے ہیں۔ تزئینی حرکتیں، مرکی وغیرہ استعمال نہیں کئے جاتے۔ اس لحاظ سے یہ فارم (ہیت)..... نستعلیق اور باوقار سمجھی جاتی ہے راگ کی صحت خوانی جانچنے میں بھی یہی معیار اور کسوٹی ہے۔ یوں سمجھئے کہ فن موسیقی کی یہ اماں ہیں۔ جس سے تمام اصناف نغمہ پیدا ہوتی ہیں..... یاد رہے کہ موسیقی کے عظیم المرتبت موسیقار میاں تان سین بھی دھرپد ہی گاتے تھے اور انہوں نے کئی دھرپدوں کے بول بھی خود لکھے ہیں۔ مثلاً راگ کا یہ دھرپد۔

بن چھائیو ڈرم بیلی مادھو بھون آتی پکاش بدن بدن پشپ رنگ لائیو گیر کسوت کھنجن انہی آنند کر۔ چھوں اور رنگ بھر لائیو! سرن تین گرام اکیس مور چھنا۔ اکت یکت لاگ ڈاٹ کر دکھائیو حسین کہے سفوا شاہ اکبر۔ پرتھم راگ بھیرو میں گائیو! میاں تان سین برہمن ہندو تھے جو ایک بزرگ حضرت محمد غوث کی دعا سے پیدا ہوئے تھے ان کی تعلیم و تربیت بھی انہیں حضرت..... کے زیر سایہ ہوئی۔ بعد میں میاں تان سین مشرف بہ اسلام ہوئے ان کا

شمار دربار اکبری کے نورتنوں میں ہوتا ہے۔ موسیقی میں ان کی خدماتِ جلیلہ کے پیش نظر مشہور مورخ اور عالم ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان الفاظ میں ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''تان سین جیسا صاحب کمال موسیقار ہزار برس سے پیدا نہیں ہوا۔''

دھرپد! سٹائل کی یکسانی اور نستعلیقی مسلمان حکمرانوں کو کچھ زیادہ نہ بھائی۔ تیرہویں صدی عیسوی میں حضرت امیر خسرو جیسا باکمال شاعر اور نابغۂ موسیقی پیدا ہوا۔ جس نے عربی، عجمی، جمالیاتی اقدار کو ہندی موسیقی میں سمویا اور گائیکی کا ایک نیا اسلوب وضع کیا جو آج کل ''خیال'' کے عرفِ عام سے مشہور ہے مسلمان اپنے ساتھ عجمیت، ندرت تخیل، حسن اظہار اور جذبۂ لطیف لے کر آئے خیال گائیکی کا طرۂ امتیاز ہے اور اُسے گرمیٔ شوق اور حدت عشق میں تپایا..... مغل دور کے بادشاہ محمد شاہ کے درباری گویوں سدارنگ اور ادارنگ نے خیال کو بام عروج تک پہنچایا اور سینکڑوں خوبصورت بندشوں اور بولوں سے اس کو مالا مال کیا اور یوں دھرپد کی مشکل پسندی کی جگہ لطیف و نادر ''خیال'' طرز موسیقی شمال ہند میں رواج پا گیا جو اب تک اپنی تمام تر رعنائی اور دلکشی کے ساتھ دلوں میں جوت جگائے ہوئے ہے۔ خیال میں مرکی مینڈھ، گمک، تان، پلٹا، کنکری، گٹری، بول تان، سرگم، زمزمے وغیرہ ''لوازمات'' بکثرت استعمال کئے جاتے ہیں..... بہادر شاہی دربار کے عظیم مطرب استاد تان رس خان نے خیال گائیکی میں مزید حسن اور دلربائی پیدا کی۔ پنجاب میں ان کے دو شاگردوں استاد علی بخش خان اور استاد فتح علی خان المعروف جرنیل کرنیل نے خیال کے عظیم الشان پٹیالہ گھرانے کی بنیاد رکھی جس سے پنجاب میں آج بھی موسیقی کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اور جس سے دلوں کے کنول لہلہائے ہیں..... استاد فتح علی خان کے صاحبزادے استاد عاشق علی خان نے اپنے باپ کے فن کو ایسے اسٹائل میں پیش کیا۔ جو جناتی گائیکی کے نام

سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس میں ان کی دقت پسندی اور مشکل آفرینی کو بڑا دخل تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا اسلوب اور طرز خیال آج بھی منفرد اور اچھوتا ہے۔ لے کاری میں بھی وہ اپنا جواب آپ تھے۔

خان صاحب عبدالکریم مرحوم نے خیال کے کیرانا گھرانے کو نیا جیون اور نئی زندگی دی جس کی نمائندہ کلاکار ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم پاکستان میں ہیں یہ گھرانہ بلمپت (مدھم لے) لے میں گانے پر خاص زور دیتا ہے۔ کیونکہ اس سے راگ کا حسن نکھرتا ہے اور پروان چڑھتا ہے پھیلاؤ اور وسعت پیدا ہوتی ہے جو کانوں کو مانوس اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ یہ گھرانا تان پلٹوں کی بے جا شعبدہ بازیوں سے گریز کرتا ہے۔

مشہور گائیک استاد بڑے غلام علی خان مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی استاد برکت علی خان مرحوم بھی پٹیالا گھرانے کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں جیالے گویئے مزامیری رنگ میں بے مثال تھے آواز کا بھرپور حسن اور لوچ جوان کے ہاں ملتا ہے۔ اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے بڑے غلام علی خان مرحوم جہاں خیال، ٹھمری اور سندھی کافی گانے میں لاثانی تھے وہاں برکت علی خان مرحوم ٹھمری، دادرے، غزل اور پہاڑی گیت میں بے مثال تھے۔ سر کے عطیے میں سرسوتی دیوی ان پر خاص مہربان تھی۔

کیرانا گھرانے کے استاد وحید خان صاحب (المعروف بہ بہرے (حیدر خان) راگ کی صحت خوانی اور بلمپت لے میں گانے پر خاص زور دیتے تھے ان کا راگ کا ادراک اور وجدان اپنے ہم عصروں کی نسبت زیادہ معتبر اور وقیع تھا۔ مرحوم فیروز نظامی انہیں کے شاگرد رشید تھے وحید خان صاحب کے ادھورے کام کو استاد امیر خان صاحب مرحوم نے بام عروج تک پہنچایا بلمپت لے میں گانے میں استاد امیر خان اپنی مثال آپ تھے اس سلسلے میں انہوں نے بھنڈی بازار والوں سے بھی کسب فیض اور استفادہ کیا اور یوں اندور گھرانے

کی شاندار بنیاد رکھی افسوس کہ استاد کلکتہ میں کار کے حادثہ میں انتقال کر گئے اور یوں موسیقی کو سوگوار چھوڑ گئے۔

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

یہاں مجھے دو نوجوان بھائیوں کا ذکر کرنا ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے۔ میری مراد استاد نزاکت علی خان اور استاد سلامت علی خان سے ہے اگرچہ ان کا خاندان دھرپدی ہے۔ لیکن انہوں نے خیال کو اپنایا اور خون جگر سے سینچا ہے۔ اور اپنا مقام اور مخصوص اسٹائل بنایا ہے۔

پٹیالا خاندان کے دو نو عمر بھائی استاد امانت علی خان، فتح علی خان بھی اپنے خاندان کے صحیح جانشین ہیں۔ وہ استاد اختر حسین خان مرحوم کے بیٹے ہیں اور خیال گائیکی کی ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن استاد امانت علی خان کی ناگہانی وفات سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو پر ہونا محال نظر آتا ہے۔ امانت علی خان بڑے سریلے واقع ہوئے تھے اور چھوٹے بھائی استاد فتح علی خان راگ کا تانا بانا بننے اور "تیاری" میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

ٹھمری اور دادرے کا عروج بادشاہ اور نواب واجد علی شاہ اختر پیا عالم کے عہد میں ہوا وہ خود ٹھمری گاتے، بتاتے اور تصنیف کرتے تھے اختر پیا ان کا تخلص ٹھمریوں کے لئے تھا۔ جیسا کہ اس ٹھمری میں ہے۔

مائی ری یہ جوبن مدھ ماتیاں
اکھتر سنگ پیت کروں گی
دھک دھک ہووت موری چھاتیاں

دراصل ٹھمری اور دادرا مغلیہ سلطنت کے دور انحطاط کی پیداوار ہے جس میں رومانٹک، عاشقانہ، بلکہ سفلی جذبات کے اظہار تک شامل ہیں مگر اس میں بھی بعض ٹھمریاں

پاکیزہ اور حقیقی جذباتِ محبت اور صوفیانہ کلام پر مشتمل ہیں۔ ٹھمری کی لے چلت اور تیز ہوتی ہے۔ عموماً ایک تال یا دادرے تال میں گائی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی ہیئت کسی مخصوص راگ میں مقرر ہوتی ہے۔ مگر خیال کے برعکس اس میں دیگر راگوں کی آمیزش اور استعمال کی اجازت ہوتی ہے۔ خیال اگر موسیقی کا قصیدہ ہے تو ٹھمری اور دادرا غزل کے مترادف ہیں جن میں محبت والفت کے گیت گائے جاتے ہیں۔

ہلکی پھلکی اور نیم کلاسیکی گانے والوں میں، مہدی حسن کا اپنا مقام ہے۔ ان کی سر میں بھیگی ہوئی گمبھیر آواز غزل گیت گانے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ صوت وآواز سے غزل کی زمینوں میں جس طرح وہ نت نئے تجربے کرتے ہیں اس نے انہیں لائٹ میوزک میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک بنا دیا ہے۔ انہیں مہدیٔ موسیقی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ٹھمری، غزل اور گیت گانے میں مرحوم استاد عاشق علی خان کی شاگرد فریدہ خانم بھی خاص ملکہ رکھتی ہیں۔ ان کی خوبصورت اور قدرے مشکل مرکیوں پر مشتمل گائیکی ''ساقی بجلوہ دشمن ایمان وآگہی'' کی یاد دلاتی ہے۔

فلمی سنگیت کا ذکر بھی کچھ بے جا نہ گا۔ ملکہ ترنم نور جہاں شعلۂ آواز سے فلم بینوں کو ایک عرصے سے روشنی بخش رہی ہیں۔ حقیقت ہے کہ فلمی میوزک کا موجودہ طرز ادا کسی حد تک ان کا ممنونِ احسان ہے۔ حتیٰ کہ لتا ان کے صوتی اظہار کی رطب اللسان ہیں۔

غالب اور موسیقی

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

میرزا اسداللہ خان غالب جامع الکمالات انسان تھے، جہاں وہ اردو اور فارسی زبان کے شاعر بے بدل تھے وہیں ہر دو زبانوں کے نثار اعظم تھے اور اردو خطوط نویسی میں ایک نئی طرز اور اسلوب جدید کے بانی..... ان کی طبعی خلاقی، ذہانت و فطانت کے ایسے ایسے نادر نمونے ان کے کلام میں نظر آتے ہیں جو بہت کم شاعروں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کی خوش طبعی، وجدانی فکر و نظر، نفیس مزاح اور انسانی برادری سے محبت اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے رگ و پے میں ایک ازلی و ابدی سرخوشی اور انبساط موج زن نظر آتا ہے جو ان کو زندگی سے بھرپور جولانی وجدت کا پیکر بنا دیتا ہے۔ غم و اندوہ میں بھی وہ خوش دلی و گرم جوشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میں ان کے اس رجحان طبع کو غالب کا ''فلسفہ نشاطِ غم'' کا نام دیتا ہوں۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

.....

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

غالب مرحوم جدید وقدیم کا ایک عجیب وغریب اور نادرالوجود مرقع تھے۔ غالب نے سرسیّد مرحوم کی تالیف کردہ ''آئین اکبری'' کی تقریظ تو لکھ دی لیکن ساتھ ہی جھاڑ پلا دی کہ کیا فضول کام میں وقت برباد کیا ہے۔ مغلوں کے کارناموں کی بجائے انگریز کی ترقی کے راز کو کاش کہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہوتی۔ دقیانوسی علوم واشیا سے ان کو سخت وحشت ہوتی تھی۔ وہ اعلیٰ ذوق وشوق کے حامل اور ارفع ذہن ونظر کے مالک تھے۔ اُن کی جدتِ طبع اور ذکاوتِ فکر عظیم تھی اور وہ بلاشبہ انیسویں صدی کی روحِ عصر تھے۔

مرزا غالب اپنے زمانے کے مروّجہ علوم وفنون سے کما حقہٗ باخبر تھے۔ علم الکلام، منطق، قانون، طب، نجوم، علم تاریخ اور موسیقی سے گہری واقفیت اور وابستگی، ان علوم وفنون کی مصطلحات سے آگاہ تھے اور ان کا برمحل استعمال اپنے اشعار وافکار میں کرتے تھے۔ مشہور جرمن فلسفی شوپنہار (Schopenhauer) کا قول ہے۔

All art aspires to the condition of Music.

(تمام فنون لطیفہ کا مطمحِ نظر اور مقصود سنگیت یا موسیقی کی سرحدوں کو چھو لینے کی کوشش تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

غالب بھی اس قول اور کلیے کی صداقت سے کلی طور پر بہرہ ور تھے۔ جہاں وہ کوئی مشکل، ادق یا اچھوتا خیال پیش کرنا چاہتے ہیں وہ موسیقی کے علائم اور تراکیب پر تکیہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی شعر میں تین اور چار تک موسیقی کی علامتیں اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں مثال:

جاں، مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب، پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

.....

نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا، یہ سازِ ہستی ایک دن

.....

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

.....

ڈھونڈے ہے اُس معنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

.....

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

.....

ساقی بجلوہ، دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

.....

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردا ہے ساز کا

وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

.....

چشم خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ، تو کہوے کہ، دُودِ شعلہ آواز ہے

.....

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

.....

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

.....

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

.....

لطف خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

.....

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

.....

شور اور ''شر'' کا تقابل یوں کرتے ہیں:

کیوں نہ ''چیخوں'' کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

.....

مقدمِ سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق، مگر ساز صدائے آب تھا

.....

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

.....

سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا

.....

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

.....

32

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
وحشت و شیفتہ، اب مرثیہ کہویں، شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

.....

دور چشمِ بد، تری بزم طرب سے، واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

.....

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر، کہ لوگوں میں نہ چھیڑے، تو مجھے

.....

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں، خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

.....

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشہ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

.....

ہم نشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

.....

میں جو گستاخ ہوں، آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

.....

کوہ کے ہوں بار خاطر، گر صدا ہو جایئے
بے تکلف، اے شرار جستہ! کیا ہو جایئے

.....

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ ہے
اُڑتی سی ایک خبر ہے، زبانی، طیور کی

.....

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں، بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

.....

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

.....

34

ہاں، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

.....

ہو جہاں گرم غزل خوانی، نفس
لوگ جانیں طبلہ عنبر کھلا

.....

ہر زہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے، آئینہ فرقِ جنون و تمکیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سرو برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

.....

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

.....

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقص ناہید

.....

مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نسخہ بیدل باندھا

.....

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمہ بیدل
"عالم ہمہ افسانہ و ما دار دو ما ہیچ"

....

ویرانی جز آمد و رفتِ نفس نہیں
ہے کوچہ ہائے نے میں غبارِ صدا بلند

....

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
منعقد محفل نشاط قریں
نغمہ مطربانِ زہرہ نوا
جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

....

واں ہجومِ نغمہ ہائے ساز، عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس، مضراب تھا

قطعہ

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا "آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب"

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

....

اے نوا سازِ تماشا سربکف جلتا ہوں میں
یک طرف جلتا ہے دل اور یک طرف جلتا ہوں میں
شمع ہوں، لیکن بپا در رفتہ خارِ جستجو
مدعا گم کردہ، ہر سو، ہر طرف جلتا ہوں میں

(غالب بہ نوعمری)

یہ امثال تو ان کے شعری کلام سے ہوئیں۔ اب ذرا ان کے خطوط اور نثری مجموعوں کو دیکھیں خواجہ غلام غوث اختر کو

غالب کہتے ہیں کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدے میں اگر تو غل رہے تو ہزار ہا بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سات شعرا میر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے۔ وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبرآباد، لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

نواب علاؤالدین خاں علائی کو لکھتے ہیں:

"..... جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کے چلتا۔"

اُن کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک نئی زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم ایک غزل لکھنی شروع کی۔ بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام کو مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔

اپنے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو رقم کرتے ہیں:

''میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہ رہا۔ نواب ضیاء الدین خان اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے ہیں جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں اس کے خط کا جواب چاہتا ہوں۔''

غزل:

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خان ضیاء دہلوی کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

''میں نے ایام دبستاں نشینی میں شرح مایۂ عامل تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور عیش و طرب میں منہمک ہو گیا۔''

میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

''اجی، وہ تو میں نے نواب صاحب کو ہنسی سے ایک بات لکھی تھی۔ دوستانہ اختلاط تھا، بھئی! میں بہرا ہوں گانا کیا سنوں گا؟ بوڑھا ہوں ناچ کیا دیکھوں گا؟ بمبئی، سورت میں انگریزی شرابیں ہوتی ہیں۔ اگر وہاں آتا اور شریک محفل ہوتا تو پی لیتا۔''

نواب امین الدین احمد خاں آف لوہارو کو ایک نامے میں فرماتے ہیں:

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت!

بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامہ کی رو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ تیسری غزل ''گوہر نتواں گفت'' اختر نواں گفت'' جو پہنچی؟ بے شبہ پہنچی ہوگی۔ تم بھول گئے ہو گے۔ وکیل حاظر باش دربار اسد الٰہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اور غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے۔ (جھنجھوٹی یاد رہے کہ یہ وہی راگنی جھنجھوٹی ہے جس میں عصر حاضر کے مقبول ترین گائیک مہدی حسن نے، فیض احمد فیض کی غزل ''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے.....الخ'' کو گا کر اپنے لیے اور فیض صاحب کے لیے بقائے دوام کی خلعت حاصل کر لی ہے) (راگنی) کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آ کر میں بھی سن لوں گا۔''

غزل:

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بے داد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرت ماہ؟
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو، بت پھر تمہیں پندار خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل دل مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ؟
خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آب بقا اور سہی
مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

مرزا غالب نے امیرانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے نانا خواجہ غلام حسین رئیس آگرہ تھے اور چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں بھی کافی متمول تھے۔ جن کے ذمہ مرزا عبداللہ بیگ خاں (والد غالب) کی وفات کے بعد غالب کی پرورش سپرد ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آگرہ کی سکونت چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ رئیسانہ ماحول میں رہنے کی بنا پر اس زمانے کی روایت کے مطابق ارباب نشاط اور نازنینان دہلی سے ان کے تعلقات استوار ہوئے اور رقص و موسیقی، رامش و رنگ اور سرور و سرود کی محفلیں برپا ہونے لگیں۔ مرزا غالب

جس صفائی اور نزاکت سے اپنے ادراکِ موسیقی کا مظاہرہ اپنے کلام اور خطوط میں کرتے ہیں وہ انھیں محفلوں اور بزموں کی دین ہے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''اللہ اللہ، ایک وہ زمانہ تھا کہ مغل (مغل جان طوائف) نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اس کے حسن کے وصف میں لکھے تھے، تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھ کو دکھائے تھے۔ اب یہ ایک زمانہ ہے کہ طرفین سے نامہ و پیام آتے جاتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ دن بھی آ جائے گا کہ ہم بیٹھیں اور باتیں کریں۔ قلم بیکار ہو جائے۔ زبان برسر گفتار آئے.....''

ایک اور خط میں انھیں کو لکھتے ہیں:

''.....کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرح دار آدمی ہیں اور بھائی تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے ''مغل جان'' سے سنا تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھی۔

اکثر نے تمہارے شعر اپنی تصنیف کے بھی مجھ کو دکھائے۔

تعزیت کے موقع پر ایک مکتوب میں ان کو رقم کرتے ہیں:

''آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے

مری تھی۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ بھئی میں بھی ''مغلچہ'' ہوں۔ عمر بھر ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ ہا آنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ عشق مجازی چھوڑ دو۔

سعدی اگر عشق کنی و جوانی
عشق محمدؐ بس است و آل محمد

اللہ بس، ماسوا ہوس.....

دیباچہ حدائق الانظار مولفہ خواجہ بدرالدین امان میں کہتے ہیں:

''.....میرا برادر زادہ خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ اماں کہ وہ ایک جوان شیریں بیاں تیز ہوش ہے اور ہر فن کے کمال کی تحصیل میں سخت کوش و سخت ہوش ہے۔ ستار کا جو خیال آیا۔ ایسا بجایا کہ میاں تان سین کو اُنگلیوں پر نچایا۔

مصوری کی طرف جو طبیعت آئی وہ تصویر کھینچی کہ اس کو دیکھ کر مانی و بہزاد کو حیرت ہوئی۔''

مرزا غالب کے شاگرد رشید مولانا الطاف حسین حالی ''یادگار غالب'' میں فرماتے ہیں:

''ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے

مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں۔ میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔ پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے مگر خاص ان کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز ان کے لیے مزعفر پکا تھا۔ وہی ان کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا۔ جو اس وقت دسترخواں پر موجود تھا۔ نواب نے اس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور اور رکابی کیا کیجیے گا۔ اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔ نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی....."

نادراتِ غالب اور خطوطِ غالب میں مرقوم ایک خط میں کس حسرت سے لکھتے ہیں:

"..... مجھ میں کہیں جانے کا دم نہیں۔ اگر بادشاہ کو توسل نہ ہوتا تو میں یہیں پڑا رہتا۔ بس میں اسی کو غنیمت جانتا ہوں۔ میرا قدردان کون کہ میں اس پر ناز کروں۔ بقول ڈوم کے جو سمجھے، وہ ہمارا غلام، جو نہ سمجھے ہم اس کے غلام۔

زندگی برگردنم افتاد، بیدل! چارہ نیست
چار باید زیستن، ناچار باید زیستن

مولانا حالی "یادگار"..... میں ہی لکھتے ہیں:

"..... شعر پڑھنے کا انداز بھی، خاص کر مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور موثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے جبکہ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مرزا غالب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے۔ چونکہ ان کے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی

تھی۔اس لیے صبح ہوگئی تھی۔مرزا نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں۔یہ کہہ کر اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پر درد آواز سے پڑھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے....."

ایک فرانسیسی شاعر کا قول ہے:

"The most despairing songs are the most beautiful."

حزنیہ نغمے حسین ترین نغمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ہماری برصغیر کی موسیقی اور شعروادب پر اس کا بالعموم اطلاق ہوتا ہے۔ہمارے ادب اور موسیقی کا بیشتر سرمایہ حزنیہ ہے۔ادب کی طرح، موسیقی میں بھی Intellect (تخیل) اور Passion (جذبہ) بلکہ Compassion (دردمندی) کا باہم مربوط اور متوازن ہونا ازبس ضروری ہے۔ورنہ موسیقار کی محنت اکارت ہو جائے گی۔فن موسیقی (میری مراد کلاسیکی موسیقی سے ہے) کی حیثیت Abstract آرٹ کی ہے۔یہ تجریدی، دقیق، باریک لطیف اور مشکل فن ہے۔ مبہم ہرگز نہیں۔یہ الفاظ کی بھی محتاج نہیں۔اس موضوع پر حضرت امیر خسرو کی بحث دلچسپ ہے۔

اس نقطے پر شعر اور موسیقی کی راہیں خفیف انداز میں علیحدہ ہو جاتی ہیں لیکن دونوں کی غایت اور مقصد ایک ہی ہے۔یعنی تاثیر کو اسیر کرنے کی کوشش۔علامہ اقبال نے اس عقدے کو اس طرح حل کیا ہے۔"تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے"

مرزا غالب مرحوم اس حقیقت سے کلی طور پر باخبر تھے۔جس انداز سے انھوں نے موسیقی کی غنایت، جلال و جمال اور شکوہ اور گہرائی کو اپنے شعری و نثری ادب پاروں میں

استعمال کیا ہے۔ وہ نہایت وقیع، رفیع الشان اور مجتہدانہ ہے۔ اُن کا ہنر، راگ، رنگ اور آہنگ کا نگار خانہ تھا اور ''فکر'' اور ''ذکر'' کا نہایت حسین مجموعہ۔

کولرج نے لکھا ہے کہ سچا شاعر روح میں موسیقی یعنی Music in soul لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ موسیقی اس کے کردار سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور جب وہ اپنے ایجاز و ارتکاز سے اسے درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے تو عظیم شاعر ہو جاتا ہے اور اس کا نغمہ، نغمہ روحانی ہو جاتا ہے۔ بقول مرحوم استاد امیر خاں صاحب، وہ نغمہ جسے روح سنے اور روح سنائے۔ میرے مطالعے اور مشاہدے کے مطابق آہنگ خسروی کے بعد نغمہ غالب ہی روح موسیقی اور جان فن شاعری ہے یعنی:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

(مرحوم) استاد عاشق علی خان

''لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں''

پنجاب میں دو زبردست گویئے کرنیل جرنیل ہو گزرے ہیں۔ نام تو اُن کا فتح علی خان، علی بخش خان تھا۔ لیکن چونکہ دونوں اکٹھے گاتے تھے۔ اس لئے علیا، فتو کے نام سے پنجاب میں معروف تھے۔ موسیقی میں اعلیٰ خدمات کی وجہ سے کرنیل جرنیل، انہیں خطاب ملا تھا..... اگرچہ آپس میں ان کا کوئی خاندانی رشتہ نہیں تھا۔ تاہم وہ ساری عمر سگے بھائیوں کی طرح رہے اور اکٹھے ہی ہمیشہ گائے..... یہ دونوں استاد بھائی، مشہور بہادر شاہی گویئے میاں تان رس خان کے شاگرد تھے۔ (تان رس خان صاحب نے، میاں اچپل خان کی شاگردی اختیار کر کے اپنے خاندان میں ''خیال رنگ گائیکی'' کی بنیاد رکھی۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے خاندان والے صرف دھرپد گاتے تھے..... تان رس خان، استاد سردار خاں مرحوم کے دادا تھے)۔ کہتے ہیں جس وقت یہ جوڑی تان رس خان صاحب کی شاگردی اختیار کرنے گئی، اس وقت بھی خاصی طیار تھی۔ خان صاحب نے انہیں کچھ سنانے کو کہا۔ اس وقت تان رس خان بوٹی پیے ہوئے تھے۔ ان کا گانا سن کر اُن کا نشہ اُتر گیا۔ اُٹھے اور پھر بوٹی پی کر آئے۔ محفل میں پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی بوٹی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس طرح متواتر تین بار یہ واقعہ پیش آیا۔ خوش ہو کر تان رس خان نے ان دونوں بچوں کو اپنی شاگردی میں لے لیا۔ انہیں دونوں کی وجہ سے پنجاب میں کلاسیکی موسیقی کا رواج ہوا۔ اور موسیقی کا عظیم مہتمم

بالشان ''پٹیالا گھرانا'' وجود میں آیا۔ جس سے تمام پنجاب نے کسب فیض کیا۔ اور اسی موسیقی کے دریا سے پنجاب کی دوسری ندیاں نکلیں۔ جن سے آج بھی دلوں کے کنول لہلہا رہے ہیں۔..... ورنہ اس سے پہلے پنجاب والے، مقبول استاد اختر حسین مرحوم، ''کھیر کھاتے تھے، ہیر سنتے تھے۔''

خان صاحب فتح علی خان (کرنیل صاحب)، الاپ، بلمپت اور راگ کے پھیلاؤ اور بڑھت میں بڑے ماہر تھے۔ اور راگ کا تانا بانا بننے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اس کے برعکس خان صاحب علی بخش خان (جرنیل صاحب) تانوں میں منفرد تھے۔ مشکل اور ادق تانیں لینا اُن کا خاص فن تھا۔ اس لئے جب یہ دو چوٹی کے گویئے گانے بیٹھ جاتے تھے تو دوسرے گویئے ٹک نہیں سکتے تھے۔ علم اور ''طیاری'' دونوں ہی ان کی لونڈیاں تھیں۔

خان صاحب فتح علی خان کے والد ماجد کا اسم گرامی خان صاحب خیرائتی اور چچا کا نام ولائتی خان صاحب تھا۔ خان صاحب فتح علی خان نے پہلے اپنے باپ خیرائتی خان سے تعلیم کا کافی حصہ لیا۔ اس کے بعد نامی گرامی گویوں کو سنا۔ اور چھوٹی عمر میں ہی گا بجا کر ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کر لی۔ بعد ازاں گوکھی بائی کی شاگردی اختیار کی اور ان کے پاس رہے۔ جو اپنے زمانے کی نائیک خاتون گزری ہیں۔ اس کے بعد، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، استاد تان رس خان صاحب کی خدمت میں پہنچے جو ۵۷ء کے بعد حیدر آباد دکن میں مقیم تھے۔ جرنیل صاحب بھی، فتح علی خان کے ساتھ تھے۔

عاشق علی خان، فتح علی خان صاحب کی واحد بڑھاپے کی اولاد تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں ایک بزرگ کی دعاؤں سے ان کی ولادت ہوئی اور انہوں نے ہی عاشق علی خان نام رکھا اور کہا کہ یہ بچہ علی کا عاشق ہوگا اور طبیعت درویشانہ ہوگی۔ عاشق علی خان ابھی بچہ ہی تھے۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ فتح علی خان صاحب کی شاگرد سردار بائی نے ان کا

ہاتھ پکڑا۔ باپ کے شاگردوں نے حتی المقدور اپنے خلیفے کو بتایا۔ اُستاد اللہ دیا مہربان خان صاحب مرحوم نے سب سے زیادہ اپنے مرشدزادے کی تعلیم میں دلچسپی لی۔ وہ موسیقار کے علاوہ شاعر بھی تھے اور مہربان تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے استادوں کی شان میں متعدد خیال بھی باندھے ہیں۔

(۱) خیال دیشکار

استھائی: آؤ جی مورے گھر پیا،
وارو‌ں تم پہ جوبن، کرم شارا
انترا: مہربان، سلطان، فتح علی خان، جرنیل، مہا کیچو، کرم کہا۔

(۲) خیال درباری

استھائی: کاہے بے کری۔ صاحب سانچو جگ کے مہربان
ھمرے کاج سنوارو۔
اُنترا: فتح علی خان جو تھے گن وِنتا
ہم نر دھن پہ گن تیرو۔ کرو سوکھی بیل، ہری بھری
کاہے بے کری......

عاشق علی خاں کے گائے ہوئے راگ پوریا دھناسری کے بول بھی مہربان خان صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ (استھائی: خوش رہے صنم میرا......الخ)

مہربان خان صاحب اور دیگر شاگرد اپنی تمام تر مساعی کے باوجود باقاعدہ اور مکمل علم موسیقی عاشق علی خان تک نہ پہنچا سکے۔ اس میں عاشق علی خان کی فقیری اور استغنا کا بھی بہت دخل تھا، لیکن چونکہ وہ بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ اس لئے اپنی کمی کو اس طرح پورا کیا

کہ جتنا علم بھی حاصل ہو سکا۔ اس کو کندن بنا کر پیش کیا۔ تان، پلٹا اور طیاری میں شاید ہی کوئی گویا ان کی برابری کر سکے۔ ان کے گانے کا آغاز ہی یہ بتاتا ہے کہ گویا مشینوں سے آواز نکل رہی ہے۔ انسانی حلق اور بشری آواز سے وہ یکسر بعید اور ماورا چیز تھی جو عاشق علی خان گایا کرتے تھے..... مشہور گائیک پران ناتھ اپنے مضمون ''موسیقار کی ڈائیری کا ایک ورق'' (مطبوعہ آج کل بابت اپریل ۶۲ء) میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے استاد عاشق علی خان کے ڈھنگ کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ عاشق علی خان صاحب اتنے خوش گلو نہ تھے مگر ان کو اپنے مخصوص انداز میں فن پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ایسی روکھی سوکھی آواز! اور اس پر ایسا پرتاثیر گانا اس کی مثال ملنا مشکل ہی ہے۔''

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بعض اوقات وہ بے سرے ہو جاتے تھے۔ میں کہتا ہوں یہی توازن کا کمال و خاصہ تھا کہ بے پناہ طیاری اور تیزی میں گا کر بھی ایک آدھ جگہ صرف احساس ہوتا تھا کہ وہ بے سرے ہو گئے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ اچھے سے اچھا سننے والا بھی جب ان کی رفتار اور طراری کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ تو اس کو خفیف سا جھٹکا محسوس ہوتا تھا۔ اور وہ خود اپنی خفت مٹانے کی خاطر خان صاحب کو بے سرا کہہ دیتا تھا۔ یہ اصل میں اپنی شکست کو بے سرا پن کا نام دینا ہے۔ عاشق علی خان کے گانے کی رفتار کے ساتھ چلنا بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔ وہ ابھی یہاں، ابھی وہاں، یہ جا..... وہ جا.....

وہ تو عجیب و غریب اور حیران کن گویے تھے۔ اُن کا اپنا سٹائل اس قدر مشکل اور نرالا ہے۔ جسے آج تک گویے نقل کر رہے ہیں۔ اور وہ چیز حاصل نہیں کر پائے جو عاشق علی خان کا طرۂ امتیاز تھی۔ اہل موسیقی کو یہ ماننا پڑے گا کہ پنجاب میں موسیقی کا جو انداز اور طریق مروج ہو۔ وہ تمام تر خان صاحب کا ہی رہین منت ہے۔ وہ اس قدر طناز اور اجل گویے

تھے کہ کلاسیکی موسیقی سٹائل ہی بدل کر رکھ دیا۔ وہ اپنے سوا سب کو گونگا سمجھتے تھے۔ اگر کسی موسیقار کی نظریں بدلی ہوئی دیکھتے تو فوراً برسرِ محفل کہہ دیتے تھے کہ آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں اور یہ چیلنج اس کیلئے موت ہوتا تھا۔

خان صاحب عاشق علی خان ایسے زبردست گویئے تھے کہ آج تک ان کی گائیکی کو ''جناتی گائیکی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا انداز اتنا اچھوتا اور پیچیدہ تھا کہ بڑے سے بڑا گویا اُن کے آگے پانی بھرتا تھا۔ جب وہ موج میں آتے تو اکثر بزرگ سنگیت کاروں سے بھی ٹکر لے لیتے..... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ خاصے نشے میں تھے۔ اپنے شاگردوں سے کہا کہ بھئی! ساز وغیرہ لاؤ کہ گائیں..... مرحوم خان صاحب عبدالعزیز خان (بینکار) بھی موجود تھے۔ وہ ان دنوں سارنگی بجاتے تھے۔ بین کی طرح وہ سارنگی میں بھی لاجواب تھے اور عاشق علی خان سے خاصے معمر تھے۔ اس روز وہ خان صاحب کے ساتھ سارنگی پر سنگت کرنا چاہتے تھے مگر عاشق علی خان نے منع کیا کہ آج آپ میرے ساتھ سارنگی نہ بجائیں۔ لیکن وہ باز نہ آئے۔ اور سارنگی لے کر پنڈال میں آ موجود ہوئے۔ پھر عاشق علی خان نے ان کو اس اقدام سے روکا اور کہا کہ اب بھی آپ میرے ساتھ نہ بیٹھیں، گو آپ سارنگی بھی ساتھ لے آئے ہیں اور آپ میرے بزرگ ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس وقت میرے ساتھ سارنگی بجائیں۔ میں نشے میں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی شان میں مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو جائے..... یہ مجھے کہیں کا نہ رکھے گی..... لیکن عبدالعزیز خان صاحب نہ مانے۔ جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو خان صاحب کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ''بات چیت'' کا اثر اُن پر کافی ہو چکا تھا۔ (عاشق علی خان چرس کو بات چیت، کہا کرتے تھے)، جلال میں آ کر کہنے لگے کہ میں آپ کے ساتھ ایک شرط پر گاؤں گا۔ اگر آپ میری صحیح سنگت کر سکے، پھر تو آپ ساری عمر سارنگی بجا سکتے ہیں۔ ورنہ آپ کو

میرے سامنے اپنی سارنگی اس بھرے پنڈال میں توڑنا ہوگی اور آئندہ کبھی سارنگی کو ہاتھ نہ لگانا ہوگا۔ عبدالعزیز خان صاحب نے مسکراتے ہوئے یہ شرط مان لی۔ اُس روز عاشق علی خان کچھ اتنی مہارت سے گائے کہ بینکار صاحب کے لئے سنگت کرنا مشکل ہوگیا اور آخر اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے از روئے شرط بھری محفل میں اپنی سارنگی توڑ دی۔ یہ واقعہ خود عبدالعزیز خان صاحب سے منقول ہے۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے وچتر وینا (گوٹ وینا) اختراع کی اور اس میں اپنی نفاست طبع اور خداداد قابلیت سے وہ گل بوٹے پیدا کئے کہ آج بھی دنیا ان کی بین کو یاد کرتی ہے۔ مگر پھر سارنگی کو عمر بھر انہوں نے بھی ہاتھ نہیں لگایا اور یوں اپنے وعدے کو پورا کیا۔

ایک محیر العقول واقعہ بھی عاشق علی خان کی طرف منسوب ہے۔ پٹیالا کے قیام کے دوران وہ بے پناہ ریاض کر رہے تھے ان کا معمول تھا کہ شام کے وقت ایک تانگے پر سوار ہو کر دریا کی طرف نکل جاتے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر پہروں گانے کی مشق کرتے۔ ابتدائی ایام میں کوچوان سخت بور ہوا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کے کان سرگم سے مانوس ہوگئے اور وہ بھی خان صاحب کے سامنے ریاض کے دوران بیٹھا رہتا۔ خان صاحب نشست جما لیتے پھر ہر چیز سے بے نیاز ہو کر موسیقی کی دنیا میں گم ہو جاتے۔ اور اس قدر ریاض کرتے کہ الامان الحفیظ! تانوں، پلٹوں، زمزموں، مرکیوں اور سرگموں کا ایک بحر ناپیدا کنار ٹھاٹھیں مارتا۔ اس طرح عاشق علی خان نے اپنی بدآہنگ آواز ایک نیا اسلوب دیا جو آج بھی تمام گویوں کے نزدیک مستحسن و پسندیدہ ہے۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ بھیروں راگ گاتے وقت خود ''مائی بھیروں'' مجسم صورت میں دریا سے نکل کر آ موجود ہوئی اور خان صاحب سے بمنت کہنے لگی۔ ''عاشق علی خان، تم روز کیوں مجھے تنگ کرتے ہو۔ جاؤ تم موسیقار بن گئے ہو.....'' یہ واقعہ خود کوچوان نے لوگوں کو سنایا۔ عاشق علی خان نے بہتیرا اس

کو منع کیا۔ لیکن وہ اس واقعہ کو افشا کرنے سے باز نہ آیا۔ یہ واقعہ کو چوان کے منہ سے نکلتے ہی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ اور لوگ اس کو لے اُڑے..... بھیروں کی قلمی تصویر سنگیت کی کتابوں میں یوں بیان کی جاتی ہے:

''گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، گول منہ، مونچھیں چڑھی ہوئیں۔ بالوں کا جوڑا بندھا ہوا۔ اس پر ایک سانپ لپٹا ہوا۔ دوسرا سانپ کمر میں لپٹا ہوا۔ بیل پر سوار۔ گلے میں زُنار۔ سرخ ریشمی دھوتی پہنے ہوئے۔ اُنگلی میں ہیرے کی انگوٹھی۔ ہاتھ میں موتیوں کی سمرن۔ عمر بارہ ہزار دو سو برس۔ ایک دھار پانی دریائے گنگا کی گائے کے منہ سے نکل کر مہادیو کے داہنے شانے پر گرتی ہے بھیروں کی شکل مہادیو سے مشابہ ہے''

یوں بھیروں کا حاضر ہونا، عاشق علی خان کا بگو بہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط۔ اس سے بحث نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مشہور کیوں ہو گیا؟ اس کی شہرت اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ عاشق علی خان اپنے عہد کا بہت بڑا اور صاحب طرز گویا تھا۔ جس کی نسبت لوگوں نے نہایت حیرت افزا واقعات منسوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

''نقوش'' کے لاہور نمبر میں سراج نظامی لکھتے ہیں:

''(مرحوم) سارنگی نواز بابا علی بخش عمر کے آخری ایام میں موچی دروازے کے اندر گانے کی ایک محفل میں تشریف لائے۔ جس میں استاد عاشق علی خان گا رہے تھے۔ کہنے لگے برسوں کے بعد گانا سن رہا ہوں۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ دیکھوں فتح علی خان کا لڑکا کتنے پانی میں ہے۔ واقعی عاشق علی فن کے لحاظ سے اپنے بزرگوں کا صحیح جانشین ہے.....''

عاشق علی خان کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ تھی کہ وہ جیسا خود گانا جانتے تھے۔ ویسا ہی وہ بتانا اور تعلیم دینا جانتے تھے۔ خود گانا نسبتاً آسان ہے لیکن دوسروں کو بھی اپنے جیسا گانا سکھانا بڑا مشکل ہے۔ لَے کاری میں بھی ان کا جواب نہیں اور لَے بدلنے میں جو مہارت ان کو نصیب ہوئی وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو.....

سراج نظامی اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

''ایک مرتبہ کلکتہ میں ایک میوزک کانفرنس میں استاد احمد جان تھرکوا ان کے ساتھ طبلہ بجانے بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ کونسا تال بجاؤں۔ آپ نے کہا جونسا آپ کا جی چاہے۔ پھر جو تانیں اُڑانی اور گر پکڑنا شروع کیا تو سامعین کا یہ حال تھا کہ تالیاں بجاتے اور کرسیوں سے اچھلتے تھے۔''

عاشق علی خان اتنا بڑا گائک ہوتے ہوئے بھی انتہائی درویش صفت انسان تھا۔ فقیر منشی اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہزاروں روپے کمائے مگر ہمیشہ داد و دہش میں خرچ کر دیئے۔ جو کسی نے مانگا دے دیا۔ اگر اپنے پاس نقدی کچھ نہیں بچی اور کسی نے سوال کر دیا ہے۔ تو تن کے کپڑے تک اُتار دیئے۔ ایک روایت اُن کے متعلق مشہور ہے کہ خان صاحب کوٹ اور برجس میں ملبوس تھے۔ سارے کمائے ہوئے روپے گھر کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہی صرف کر آئے۔ دروازے پر پہنچے تو کسی سائل نے کہا ''بابا عاشق علی! ہمیں بھی کچھ دیتے جاؤ۔ آج کل تو سخت سردی پڑ رہی ہے۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا تک نہیں ملتا''..... اُسی وقت کوٹ اور برجس اس کو پہنائی۔ خود صافہ باندھے ننگ دھڑنگ سڑک پر کھڑے سوں سوں کر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک ہندو رئیس آ گیا۔ اس نے پوچھا ''خان صاحب! یہ کیا حال بنا رکھا ہے'' بولے، ''سیٹھ! فقیر کو مل گیا تو پہن لیا۔ ورنہ

یوں ہی گزارا کرلیا۔" رئیس نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور گھر پہنچ کر نیا سوٹ پہنایا۔ اگلے دن اس کا حشر بھی یہی ہوا کہ وہ کسی اور کے جسم پر نظر آیا!!! اب ایسی درویشی کہاں نظر آتی ہے..... دراصل خدا ترسی کا یہ جامہ اُن پر خوب سجتا تھا۔

موجودہ دور کے تقریباً سبھی گویوں نے عاشق علی خان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر لیا ہے۔ استاد بڑے غلام علی خان اور استاد امید علی خان تو مدت تک ان کی معیت میں گاتے رہے تھے..... جواُن کے باقاعدہ شاگرد ہو کر فیض یاب ہوئے، ان کے نام یہ ہیں.....

سندھ میں نواب اور گولی، پنجاب میں استاد اللہ رکھا (طبلہ نواز)، مختار بیگم، فریدہ خانم، ملکہ پکھراج اور فلم سٹار منورما، زاہدہ پروین، کابل میں استاد محمد حسین سرہنگ۔

خان صاحب نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اور تجرد کی زندگی گزار دی۔ اُن کے لاابالی پن نے کبھی یہ برداشت نہ کیا۔ کہ وہ پابند زندگی بسر کریں۔ عمر بھر انہوں نے فقیری میں بادشاہی کی، کوئی مادی لالچ اور لوبھ ان کو صحیح بات کہنے سے نہ روک سکا۔ سچے سر نے ان کے دل و دماغ کی تمام کدورتوں اور آلائشوں کو دھو دیا تھا۔ ان کا ضمیر روشن تھا اور دماغ بیدار..... ان کی حس ذکاوت تیز تھی اور روح بے داغ!.....

آخر ۱۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو یہ گنج کلاہ فقیر، شہنشاہ موسیقی، خدا ترس انسان اور شفیق استاد لاہور میں انتقال کر گیا۔ تکیہ میراثیاں، چیمبر لین روڈ میں ان کی تدفین ہوئی..... یہ مصرع ان پر کس قدر صادق آتا ہے.....

"ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے"

خوش خط گویا اُستاد بڑے غلام علی خان

(پیدائش ۱۴ اپریل ۱۹۰۲ء قصور، لاہور/ وفات ۱۲۳ اپریل ۱۹۶۸ء حیدر آباد دکن)

میرے سنگِ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد!

بڑے غلام علی خاں ہر لحاظ سے بڑے تھے۔ عظیم شخصیت، بڑا موسیقار، اعلیٰ تخیل اور بے مثال آوازِ شیریں کے مالک، مجلسوں کے روحِ رواں..... مخیّر، سخی نیک دل، نیک سرشت، بذلہ سنج، ایک بڑی اور مکمل شخصیت تھے۔ اُن کی وفات سے موسیقی کا ایک درخشاں دور ختم ہو گیا۔

بقول اُستاد سلامت علی خاں مرحوم:

''قدرت ہم موسیقاروں کو ایک آدھ خوبی سے نوازتی ہے۔ غلام علی خاں صاحب کو مبدائے فیاض نے اکٹھی چار پانچ چیزیں بخش دی تھیں: سو فیصد خوبصورت آواز، شاعرانہ حسن تخیل، لاجواب تنت کار (سارنگی نواز)، جمالیات کے پرستار، بے پناہ ریاضت کے پیکر، فیاض اور غنی طبیعت کے مالک۔ نسلاً در نسلاً مطربوں کی اولاد۔''

بڑے غلام علی خاں پٹیالا گھرانے کی آبرو تھے۔ پہلے اپنے والد استاد علی بخش سے تعلیم لی۔ بعد ازاں اپنے چچا استاد کالے خاں سے کسبِ ہنر کیا جو اپنے عہد کے فقید المثال گویئے

تھے۔ دونوں بھائی پٹیالا گھرانے کے بانی استاد فتح علی خاں کے شاگرد تھے۔ غلام علی خاں صاحب بڑے منصف مزاج اور مرادوند سنگیت کار تھے۔۔ اساتذۂ فن سے انہیں دلی محبت تھی۔ جہاں خوبصورت چیز ملی نذر دے کر حاصل کرتے۔ مرحوم موسیقار سیندھے خاں سے علم حاصل کیا۔ کیرانا گھرانے کے عظیم نمائندہ موسیقار استاد وحید خاں صاحب (بہرے) سے بھی کافی متاثر تھے۔

رفیق غزنوی مرحوم کا کہنا ہے کہ میں نے ان تینوں یعنی استاد علی بخش خاں، بڑے غلام علی خان اور استاد برکت علی خاں کو خوب خوب سنا ہے..... اُن کو کبھی بھی بے سرا ہوتے نہیں دیکھا۔

فیروز نظامی صاحب کا ارشاد ہے: رسیلے گلے کی تان کا جمالیاتی حسن، تاثیر اور مقبولیت ان کے حصے میں بدرجہ اتم آئی تھی۔ بقول اقبالؒ:

؎ تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے!

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ بڑے منصف مزاج تھے۔ کلکتہ کا واقعہ ہے۔ اس کے راوی استاد سلامت علی خاں مرحوم ہیں۔ ''استاد توکل خاں کی وفات کی اطلاع آئی۔ بڑے غلام علی خاں کے پاس عظیم قوال استاد مبارک علی خان اور استاد فتح علی خاں بہر ملاقات آئے ہوئے تھے۔ میں بھی حاضر تھا توکل خان صاحب کی وفات کی خبر سن کر غلام علی خاں صاحب بالکل خاموش ہوگئے۔ استاد نصرت مرحوم کے والد استاد فتح علی خاں کے پوچھنے پر گویا ہوئے کہ توکل خان ایسا گویا تھا۔ میں ساری عمر خدا سے دعا مانگتا رہا کہ مولا! اس کے ساتھ مجھے آگے پیچھے نہ گانا پڑ جائے۔''

حکیم محمود مرتضیٰ (ہوشیار پوری) ریٹائرڈ آرمی پرسونل (رنگون، برما) میرے موسیقی میں استاد تھے۔ (اُن سے میں نے راگ بھیروں اور تین تال کی تعلیم لی تھی)۔ وہ ہمیشہ غلام

علی خاں صاحب کو میاں غلام علی خاں کہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب موصوف بیک وقت عاشق علی خاں صاحب اور پنڈت اومکار ناتھ ٹھاکر کے شاگرد تھے۔ دونوں بزرگوں کا گانا خود طبلہ بجا کر سنایا اور گایا کرتے تھے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ رب العزت ان کی قبر پر بارش انوار کرے۔"

بمبئی میں خان صاحب کی ایک شاگرد تھی گنگا بائی۔ اس کے گھر کے سامنے شام کو غلام علی خان کی نشست ہوتی تھی۔ اس کے بالمقابل استاد امیر خان صاحب کی شاگرد منی بائی کا مکان تھا۔ دونوں جگت استاد اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے محفل لگاتے۔ جگتیں اور چہلیں ہوتیں۔ علمی اور فنی نکات پر بحث ہوتی۔ یہ روز کا معمول تھا چار پانچ سال ہوئے میں بڑے غلام علی خاں کے ایک عزیز شاگرد شوکت کے ساتھ اس علاقے سے گزرا۔ شوکت بھائی مرحوم نے اشارہ کیا کہ غلام علی خان اس جگہ شام کو بیٹھا کرتے تھے۔ ہم آگے بڑھے تو دیکھا وہاں اب ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اتنے میں ایک باریش بزرگ نکلے، وہ مسجد کے امام تھے۔ استفسار پر کہنے لگے۔ ہاں! خان صاحب بڑے غلام علی خاں اس جگہ بیٹھا کرتے تھے..... اللہ اکبر اللہ اکبر، کیا مومن و موحد ہستی تھے

ہر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

(حافظؒ)

سن اکسٹھ میں خاں صاحب پر فالج کا حملہ ہوا۔ مختلف علاج کیے طبیعت سنبھل گئی۔ ممبئی کے مضافات میں گندھک ملے پانی کے چشمے ہیں۔ وہاں بھی استاد ولائت خاں (ستار نواز) انہیں لے کر گئے۔ میری بیوی خورشید اولیا (دختر استاد اللہ رکھا) بچی تھی۔ وہ بھی اپنے پھوپھا، پھوپھی کے ساتھ گئی۔ یاد رہے خاں صاحب کی بیگم، استاد اللہ رکھا کی منہ بولی بہن

بنی ہوئی تھیں۔ بقول خورشید ایک دن خاں صاحب سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے گر پڑے۔ بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

سخت چوٹیں آئیں۔ گویا ہوئے: میں بڑا گناہ گار ہوں۔ مالک مجھے سزا دے رہا ہے۔ لیکن میں اس کی رحمت کا طلب گار ہوں۔ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔

بقول مولانا گرامیؒ:

عصیانِ ماور رحمت پروردگارِ ما
ایں را نہایتیست نہ آں را نہایتے

مرحوم کے بھانجے بشیر علی ماہی سے میری اکثر ملاقاتیں رہیں۔ چھوٹے ماموں استاد برکت علی کے انداز میں بڑی خوبصورتی سے گاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بڑے ماموں غلام علی خان صاحب جب تلاوتِ قرآن فرماتے تھے۔ تو گویا لگتا تھا در و دیوار کو کان لگ گئے ہیں۔ اور وہ بھی ان کی تجوید اور قرأت کو سن رہے ہیں۔ ایسی حلاوت اور دل سوزی سے مصحف آسمانی پڑھتے تھے کہ ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔

اُن کے ۳،۳ منٹ دورانیے کے ریکارڈ مثالی ہیں۔ ان سے بڑھ کر راگ داری کی مکمل تصویر، میری دانست میں، نہیں ہو سکتی۔ یاد رہے کہ وہ چالیس کی دہائی میں بھرے گئے تھے۔ سارے کے سارے مستند، میجر پر۔ مثلاً گجری ٹوڑی (بھور بھٹی)۔ دیسی ٹوڑی (منوالرزسے) پرچ (لٹک چلے تو)۔ مالکوس (مندر دیکھا ڈرے)۔ درباری (بنج رے ہرنام)۔ کامود (چھوڑ دے مورا انچرا)۔ جے جے ونتی (بنتی کا کریئے)۔ کیدارا (نویلی نار)۔ بھیم پلاسی (بے گن آئے) اڈرنا (جیسی کریئے)۔

حیرانی ہوتی ہے کہ ایک ہی گلے میں تین مختلف اصنافِ موسیقی کا قیام تھا۔ یعنی ساورا۔ خیال اور ٹھمری اور وہ بھی فن کی انتہائی بلندیوں پر یہ ایک جینیس اور عبقری شخصیت غلام علی خاں ہی کر سکتی تھی۔ مثالی ٹھمریاں درج ذیل ہیں:

آئے نہ بالم (بھیرویں)۔ سیاں بولو۔ (پیلو)۔ یاد پیا کی آئے (کوشک دھنی، مانڈ)۔ پریم کے پھندے میں (بھیرویں)۔ مارن مٹھیوں (سندھی کافی)۔ نیناں مورے ترس رہے (جنگلہ بھیرویں)۔ کٹے نہ برہا کی رات (پیلو)۔ پریم کی مارے کٹار (سوہنی)۔ ترچھی نجریاں کے بان (پہاڑی)۔ پریم اگن جیارا (کجری)۔

اُن کے آل انڈیا ریڈیو کے ایک انٹرویو میں بنیادی موضوع تھا۔ فوک (لوک موسیقی)، کلاسیکی موسیقی کی بنیاد ہے۔ یہ ارضی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے حقانی، الوہی، رُوحانیات کی سفر کرتی ہے۔ اس انٹرویو میں خان صاحب ایک پروفیسر، عالم اور دانشور کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ اُردو ایسے لہجے میں بول رہے ہیں گویا لکھنو یا کانپور کی کوئی باذوق اور مہذب ہستی محوِ تکلم ہے۔ مشہور زمانہ ستار نواز پنڈت روی شنکر کا کہنا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر گفتگو نہیں ہو سکتی۔

فنی خصوصیات: تان کی کبھی تکرار نہیں کرتے تھے۔ اُپج اپنے معراج پر تھی۔ بول تان نفیس اور برجستہ ہوتی تھی۔ خوبصورت اور فی البدیہہ تہائیوں سے خیال میں چار چاند لگاتے تھے۔ پر کیف اور اثر انگیز گائیکی کے حامل تھے۔ بقول سید ذوالفقار علی بخاری مرحوم

نغمگی کے قدِ بالا پر قبائے ساز تنگ

امیر خان صاحب.....امیرِ موسیقی

(۱۹۷۴ء.....۱۹۱۲ء)

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
صرف ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں، بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

(جوشؔ)

رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ بدھوار کا دن تھا۔ تاریخ ۱۳ فروری ۱۹۷۴ء ایک کار لوئر سرکلر روڈ کلکتہ پر جا رہی تھی۔ جب یہ ایک چوک پر پہنچی تو ابھی بمشکل کار کا بونٹ کراسنگ سے گزرا بھی نہ تھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی نے آ کر پیچھے سے ٹکر ماری۔ دونوں کاریں لٹو کی طرح گھومیں پہلی کار کا دروازہ یکلخت کھلا۔ دو جسم یکے بعد دیگر باہر گرے.....لمبا آدمی جو پہلے گرا۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے بجلی کے مین بکس سے ٹکرایا۔ اس کے بعد عورت گری لیکن لمبے قد کے آدمی کے جسم نے عورت کو سخت چوٹوں سے بچا لیا۔ کار کے اگلے دروازے سے شمس الزماں باہر نکلا جو کلکتہ کا صحافی اور ادیب تھا۔

طویل القامت آدمی خیال گائیکی کا عظیم المرتبت موسیقار اُستاد امیر خان تھا.....جس نے صنف موسیقی کو نئی جہت اور جدید سمت بخشی اور جو گزشتہ تیس ۳۰ برس سے مسند موسیقی پر

کجکلاہ بادشاہ کی طرح جلوہ افروز تھا۔

اُن کے منہ سے صرف لفظ ''اللہ'' نکلا۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ان کی جان بچ جائے .....مگر بے سود..... آدھی رات ہونے سے پہلے انہوں نے جان جان آفریں کے سپرد کردی.....ان کے انتقال سے خیال گائیکی کا ایک سنہری دور ختم ہوگیا۔ گویا

حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں
مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے

مرحوم امیر خاں صاحب ۱۵ اگست ۱۹۱۲ء کو سارنگی اور بین کے عظیم استاد شہ میر خاں صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ جائے ولادت کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ سوشیلا مصرا کلانور (پنجاب) لکھتی ہیں۔ سنگیت مہا بھارتی کے بروشر میں اکولا (مہاراشٹر) درج ہے۔ کوئی ان کی جنم بھومی اندور (مدھیہ پردیش) بتاتا ہے۔ اور کوئی جیند[1] (پنجاب)..... بہر کیف یہ مسلم ہے کہ ان کا بچپن زیادہ طور پر اندور میں گزرا۔ جہاں اُن کے والد درباری موسیقار تھے۔ اپنے والد ہی کے شاگرد ہوئے۔ سارنگی اور گائیکی دونوں کی تعلیم لی۔ اوائل عمر ہی سے مشکلات فن پر عبور حاصل کرلیا۔

ذہن رسا اور طبیعت براق تھی اور مشکل تانوں کو از بر کرلیا۔ راگوں کے رموز، اور لے کی روانی کو سمجھ گئے.....ان کے پتاجی اپنے گھر میں جمعہ کی نماز کے بعد محفل موسیقی جمایا کرتے تھے جہاں مبتدی اور منتہی سبھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ یہیں خان صاحب کو استاد رجب علی خاں (دیواس والے) مراد خاں بینکار، استاد بندو خاں صاحب (سارنگی نواز) جیسے جید اساتذۂ فن کو سننے کا موقع ملا۔ مگر جب استاد امیر خان نے، استاد بہرے وحید خاں صاحب کو سنا تو ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ان کو اپنی ساری زندگی کی دعاؤں کا

(۱) میرے عزیز دوست بلبیر سنگھ کنول کے بقول چکرورتی صاحب کی روائیت

(۲) خان صاحب کے پاسپورٹ پر جائے پیدائش اندور درج ہے۔ ایوب

ثمرہ مل گیا۔ وہ اسی اسلوب اور انداز کی تلاش میں تھے، بلپت لے میں وحید خاں صاحب جس طرح راگ میں درجہ بدرجہ بڑھتے تھے۔ وہ روش باقاعدہ بھی تھی اور عالمانہ بھی۔ مہرو کھنڈ (Permutation and Combination) پر استاد وحید خاں کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ اس لحاظ سے کیرانہ گھرانے میں ایک منفرد اور وقیع مرتبہ رکھتے تھے۔ امیر خاں صاحب نے بالواسطہ، وحید خان صاحب کے اندازِ خیال کو اپنے فن میں سمویا..... دوسرا اثر انہوں نے استاد رجب علی خاں سے لیا جو تانوں کے بادشاہ تھے۔ نادر، اچھوتی اور دلکش تانوں کا تانا باتا جس طرح وہ بنتے تھے وہ حیران کن بھی تھا اور دل پذیر بھی۔ رجب علی خاں ان کے عزیز بھی تھے، اور ان کے والد کے نہایت قریبی دوست بھی۔ اس جدید رنگ کو امیر خاں کی ایجاد پسند طبیعت نے اُچک لیا اور اپنی طبعی خلاقی سے اس کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

تیسری شخصیت جو امیر خاں صاحب کو مسحور اور متاثر کر گئی وہ مرحوم استاد امان علی خاں (بھنڈی بازار والے) تھے۔ سرگم کو جس ساحرانہ چابک دستی سے وہ ادا کرتے تھے۔ وہ اُنہیں کا حصہ تھی..... بمبئی میں آمد و رفت سے، خان صاحب کی، امان علی خان سے بڑی گہری دوستی ہوگئی..... اور یوں تبادلہ خیالات سے رموزِ فن موسیقی، استاد امیر خاں صاحب نے حاصل کیے۔ وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے۔

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض!

مرحوم امیر خاں صاحب کی گائیکی بڑی پرسکون اور کیف بخش تھی۔ آسودگی اور طمانیت بخش تھی۔ یوں لگتا تھا گویا کوئی صوفی رشی فکر و ذکر کر رہا ہے۔ ان کے گانے کا کمال چین ہی چین تھا۔ ولمپت لے میں اُن کے جوہر کھلتے تھے۔ راگ کی صحیح خوانی اور خیال کی اُپج ان کا

خاصہ تھا۔ اُن کو اپنے کمال فن پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دفعہ راگ ماروا متواتر تین چار گھنٹے گاتے رہے اس فنکاری کا ٹیپ آل انڈیا ریڈیو کے Archives میں موجود ہے۔ یہ راگ وِکر اور خشک ہے، وادی اور سموادی سروں یعنی کھِب اور دھیوت میں ساڑھے پانچ سروں کا فاصلہ ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے دو عظیم استادوں بڑے غلام علی خاں اور استاد امیر خاں صاحب نے اسی راگ سے اپنی حیثیت کو منوایا۔

غرض امیر خاں صاحب بلمپت دُرت اور ترانہ گانے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ دُرت لے میں رقص اور ناچ کا اسلوب ان کی لے کاری میں در آتا تھا۔ چونکہ مطالعہ اور شاعری سے بھی گہرا تعلق تھا اس لئے ترانہ میں فارسی شعر یا رباعی کا بڑا برمحل استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ابھوگی کالہڑا کے ترانے میں خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر گاتے ہیں

ہر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

درباری کے ترانے یارِ من، بیا بیا میں اس فارسی فرد کا استعمال کرتے ہیں۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

دراصل یہ ترانہ آفتابِ فلکِ علم موسیقی تان رس خاں دھلوی کی تصنیف ہے۔

استاد مرحوم خیالوں کی جید اور مستند استھائیاں گاتے تھے۔ مثلاً

درباری: حجرت ترکمان کے بل بل جاؤں

اور مزید درباری: گمانی جگ تج گیو۔ (از سدارنگ)

ایمن: گرو بن کیسے گن گاوے
گرو نہیں مانے تو گن ناہیں آوے

بے گن۔ گنین میں بے گن کہاوے (تصنیف میاں اچپل)

بلاس خانی ٹوڑی: بن کے پنچھی باورے.....

اُن کے گائے ہوئے خیالوں میں بڑا تنوع گہرائی اور جامعیت ہے۔ جس سے ان کی موسیقی دانی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ میرے ذخیرے میں ان کے گائے ہوئے یہ راگ ہیں:

پوریا۔ درباری۔ مالکونس، ماروا۔ بھیروں۔ نٹ بھیروں۔ للت۔ میگھ۔ کومل رکھب اساوری میاں کا ملہار۔ رام داسی ملہار۔ ابھوگی کانہڑا۔ بیراگی بلاس خانی ٹوڑی دیشکار بھٹیار رام کلی۔ باگیشری۔ شہانہ کالہڑا۔ سوہا کانہڑا۔ ایمن۔ ایمن کمیان۔ آتندی باتند کلیان۔ راگیستری۔ جوگ۔ ملتانی۔ دیسی۔ جے جے ونتی۔ شدھ بہاگ۔ شدھ کلیاں۔ بسنت بہار۔ اڈانا۔ بھیم پلاسی۔ بروا۔

اچھوپ راگ: چاندنی کیدارا۔ ہری کونس۔ کونسی کانہڑا۔ چندر مدھو۔ ہنڈول بسنت۔

کرناٹک راگ: ہنس دھنی۔ واچسپتی۔ جن سن موہنی۔ بسنت مکھاری (حجاز کی مماثلت)۔ چاروکیشی۔ کلاوتی۔

جدتیں اور اختراعیں: کلاشیری۔ چندر مدھو۔

راگ بیراگی میں ان کی اپنی ترتیب دی ہوئی یہ بندش بھی لائق تحسین ہے۔

من سمرت نس دن تمرونام

اب تم ہی سدھارو سگرے کام

ہوں بے گن کچھو، گن نہیں منہ میں

تمرشرن اب لیؤ وشرام

امیر خان صاحب ولمپت لے کیلئے اکثر جھمرا تال، جھپ تال استعمال کرتے تھے۔ جھمرا تال میں سم کے بعد ایک ماترے کا وقفہ آتا ہے۔اس میں ان کو ''تفکر'' کیلئے موقع مل جاتا تھا۔ جو بڑے خیال کیلئے بہت بڑی سہولت ہے۔غرض ان کا فن ذکر وفکر کا حسین مجموعہ تھا۔تکنیک اور فن امیر خان کے تخلیقی ذہن میں معراج پر تھے۔

ڈھونڈھے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

استاد برکت علی خان

گائیکی کے متولوں کو قصوریوں نے لوٹ لیا ہے۔ خواہ وہ کالے خان ہوں یا بڑے غلام علی خاں، برکت علی خاں ہوں یا بشیر علی ماہی، نور جہاں ہوں یا نذیر بیگم، آواز کے ایک ہی وار سے گھائل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سُر یلا پن اور سنگیت کی شیرینی قصور کے گویوں پر ختم ہے۔۔۔۔۔

یہ خصوصیت پٹیالے کے گھرانے کی دین ہے۔ خان صاحب کالے خاں، کرنل صاحب (فتح علی خاں) کے شاگرد ہوئے علم موسیقی سے ان کی لگن اس قدر زیادہ تھی کہ وہ سوتے میں بھی گاتے رہتے تھے اور منہ کھلا رہتا تھا۔ ایک دفعہ فتح علی خان صاحب نے سوتے میں ان کا منہ کھلا ہوا دیکھ لیا اور ہنس کر کہا۔۔۔ کالے خاں عالم خواب میں بھی ہمارا علم نگلے جا رہا ہے۔ آفرین ہے اس شوق پر، علم کی یہ جوت ہی تھی جس نے اس سارے خاندان کو نور کا گلا عطا کیا۔ بلکہ سارے قصور کو ہی سُر کی بادشاہت بخش دی۔ یہ کالے خان صاحب بڑے غلام علی خان اور استاد برکت علی خان کے حقیقی چچا تھے۔۔۔ جنہوں نے برسوں کی محنت شاقہ سے علم موسیقی کی دیوی کو رام کیا۔ ان کا جذبہ طلب اس قدر صادق تھا کہ سرسوتی دیوی آج بھی ان کے خاندان پر عاشق ہے۔ اس خاندان کے بچہ بچہ کے گلے میں وہ سوز پایا جاتا ہے۔ جسے بصیغۂ مبالغہ لحنِ داؤدی کہہ سکتے ہیں۔۔۔ اس خاندان کے موجودہ دو نمائندہ گلوکار ہیں خان صاحب استاد بڑے غلام علی خان جو کلاسیکی موسیقی کے لعل نایاب ہیں اور

استاد برکت علی خان جو ہلکی پھلکی گائیکی میں اپنی مثال آپ ہیں اور جنہیں بجا طور پر لائٹ میوزک کا مجتہد کہا جا سکتا ہے۔

استاد برکت علی خان استاد بڑے غلام علی خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ان کے والد کا نام خان صاحب علی بخش خان ہے جو خود بھی بڑے اچھے گویے تھے۔۱۹۱۰ء کی کسی نیک ساعت میں چوک نواب صاحب موچی دروازہ میں وہ پیدا ہوئے۔موسیقی کا گھر میں ہی دور دورہ تھا۔باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔چنانچہ ان کے والد نے اپنے بچے کو موسیقی کا سبق دینا شروع کیا۔اس کے بعد اپنے بڑے بھائی غلام علی خاں کی طرف رجوع کیا۔جو اپنے عہد کا سب سے رسیلا گویا ہے۔جس نے ہزاروں دلوں کو موسیقی کے ذریعے ہنسایا اور رُلایا ہے۔افسوس ہے کہ ہم اتنے بڑے باکمال سے محروم ہیں۔

خان صاحب غلام علی خان نے برکت علی خان کو آواز لگانے کے وہ وہ انداز بتائے کہ آج ٹھمری، غزل گانے میں ان کی طرز میں گانے والا کوئی مثیل نہیں ملتا۔پیہم ریاض اور کوشش سے انہوں نے ہلکی پھلکی موسیقی میں اس درجہ کمال حاصل کر لیا ہے کہ خود خان صاحب غلام علی خاں صاحب سے ٹھمری گانے کی فرمائش کی۔خان صاحب نے شروع کرنے کو کر دی مگر ساتھ ہی کہا کہ۔۔۔۔ٹھمری تے بکو دا حصہ اے۔

برکت علی خان ٹھمریوں کو اپنے مخصوص نرم و نازک لہجے میں ادا کرتے ہیں۔تو ان میں گویا روح ڈال دیتے ہیں۔ہولے ہولے سروں میں وہ صوت و آہنگ سے ایسے ایسے گل بوٹے بناتے ہیں کہ سننے والا ششدر رہ جاتا ہے۔خان صاحب دھیرے دھیرے ہارمونیم میں ہوا بھرتے جاتے ہیں۔ان کی بھاری انگلیاں سروں پر مچلتی ہیں۔ساتھ ہی گلے کا نور لپکتا ہے اور ساز و آواز کا یہ امتزاج ایک حسین و دل کش مرقع موسیقی کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔جس میں برکت علی خاں کی روح شخصیت اور فن مدغم ہوتا ہے۔قصوریوں کا سوز اس

میں رچا بسا ہوتا ہے۔ غلام علی خاں کا پرتو اس میں نظر آتا ہے اور پٹیالہ گائیکی کی چھاپ اس پر نمایاں ہوتی ہے۔ بہادر شاہی موسیقار خان صاحب تان رس خاں کے علم کی پرچھائیں بھی صاف نظر آتی ہیں۔

ٹھمری کی طرح غزل میں بھی ان کا انداز منفرد ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ برکت علی خان نے ہی لوگوں کو غزل گانا سکھایا۔ چنانچہ خان صاحب عاشق علی خان اپنی ہونہار شاگرد فریدہ خانم سے کہا کرتے تھے کہ برکت علی خان کا گانا غور سے سنا کرو۔ غزل اور ٹھمری گانے میں تمہیں مدد دیگا۔ اس کے گانے میں نفاست اور بانکپن ہے اور ایسی خوشبو اس کی گائیکی میں موجود ہے جو سدا بہار اور البیلی ہے۔

مرحوم خان صاحب جھنڈے خان صاحب بھی ان کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ لاہور کے کسی سٹوڈیو کی بات ہے، گانے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ خان صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ ریہرسل کے دوران میں ٹھیکہ لگانے والا گڑبڑ کرنے لگا۔ برکت علی خان سمجھ گئے کہ دانستہ خراب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کو احساس نہ ہونے دیا اور کسی نہ کسی طرح لے میں گاتے رہے۔ جھنڈے خان صاحب بھی تاڑ گئے اور خوش ہو کر برکت علی خان صاحب سے کہنے لگے۔۔۔۔ بُھلیا ہویا وی سوہنا پیا لگنا ایں۔۔۔۔۔

خان صاحب نے بہت سی غزلیں اپنے اچھوتے انداز میں گائی ہیں۔ جن کا شمار بہت مشکل ہے لیکن وہ غالب کی غزلیں گاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب بھی اپنی غزل سننے مجلس میں آ بیٹھے ہوں۔ خصوصاً یہ غزل کافی ٹھاٹھ کی دھن میں گاتے ہیں۔

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

ادائیگی اور صحت تلفظ کا کیا کہنا۔

عالم جوانی میں ان کا اٹھنا بیٹھنا ڈاکٹر تاثیر مرحوم، ڈاکٹر نذیر، مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم، صوفی تبسم وغیرہم کے ساتھ ہوتا تھا۔ علامہ اقبال کے پاس بھی اکثر جایا کرتے تھے۔

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم سے تو بہت ہی زیادہ مراسم تھے۔ اکثر ملاقات رہتی۔ ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو "ماہیے" کا ذکر چھڑ گیا۔ خان صاحب کہنے لگے حسرت صاحب! پنجابی ماہیا گاتا ہوں تو اہل زبان اردو کو بہت پسند آتا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ پنجابی ماہیے کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ حسرت صاحب نے بیٹھے بٹھائے اردو میں ماہیے لکھنے شروع کر دیئے۔ جسے خان صاحب نے جھنجھوٹی ٹھاٹھ کی دُھن (پہاڑی) میں ریکارڈ کرایا۔ ان ماہیوں میں سے چند ایک درج کئے جاتے ہیں۔

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

یہ رقص ستاروں کا
سن لو کبھی افسانہ
تقدیر کے ماروں کا

ساون کا مہینہ ہے
ساجن سے جدا رہ کر
جینا کوئی جینا ہے

راوی کا کنارا ہو
ہر موج کے ہونٹوں پر
افسانہ ہمارا ہو

اب اور نہ تڑپاؤ

یا ہم کو بلا بھیجو

یا آپ چلے آؤ

دل میں ہیں تمنائیں

ڈر ہے کہ کہیں ہم تم

بدنام نہ ہو جائیں

برکت علی خان نے فلموں میں بھی چند ایک نغمے دیے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، فلم ''دو آنسو'' کا مشہور گانا

اک غم کے سوا اس دنیا میں اب اور ہمارا کوئی نہیں

خان صاحب کا ہی گایا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فلم ''شکریہ'' کا گیت ''جگ ہے گڑیوں کا کھیل'' بھی اُن کی آواز میں ہے اُنہوں نے فلمی موسیقی میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔ جن کو ضرورت ہوئی خود گھر چل کر آتے۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر چند ایک نغموں میں شریک ہوئے لیکن یہ بات واضح ہے کہ فلمی دنیا کا موجودہ سٹائل بہت حد تک اُن کا رہین منت ہے۔ خیال گائیکی کی تعلیم کے باوجود نئے نئے تجربات کیے۔ ٹھمری، دادرے، غزل اور گیت میں بھی وہ رعنائی اور نغمگی پیدا کر دی جو خیال سے مختص سمجھی جاتی تھی، اپنے گلے کے سوز سے ہلکی پھلکی موسیقی میں ایسا جادو جگایا کہ صرف خیال سننے کے رسیا بھی ان کا گانا سن کر وہی جذبہ محسوس کرتے ہیں جو کلاسیکی موسیقی کا حصہ ہے اس کے علاوہ برکت علی خان نے دوسرے ملکوں کی موسیقی سے بھی استفادہ کیا ہے اور نیم کلاسیکی اور ہلکی پھلکی موسیقی میں اس طریقے سے اضافہ بھی کیا ہے۔ ہر باشعور فن کار کی طرح وہ ہر اچھی چیز کا سواگت کرتے ہیں۔ لائٹ میوزک میں مصری طرز کو سب سے پہلے انہوں نے ہی متعارف کرایا۔ اس میں

حافظ اور نظیری کا کلام گا کر ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی، جو فارسی کلام کے لیئے نہایت موزوں ہے۔

برکت علی خان کی سب سے نمایاں خوبی آواز کا رچاؤ ہے۔ وہ ملائمت اور سادگی جوان کی آواز میں ہے، خال خال موسیقاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت کم گویئے دیکھے گئے ہیں جو گاتے وقت منہ نہ بناتے ہوں۔ اکثر تعداد ایسے گائیوں کی ہے جو آواز سے کشتی لڑتے ہیں۔ تان لیتے وقت انگلیاں اینٹھ جاتی ہیں۔ زانو پر دو ہتڑ مار رہے ہیں۔ گویا کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہے۔ جس سے زور آزمائی ہو رہی ہے گرمی میں آ کر تان جو پلٹی تو سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ مگر گائیک کو اس کا کچھ احساس نہیں، وہ اپنی "صوتی جنگ" میں بری طرح الجھا ہوا ہے۔ کوئی ان سے الجھا ہوا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے "میاں گاتے ہو کہ ڈراتے ہو"۔ سہولت سے گانا بھی برکت علی خان کے فن کی ایک خاص خوبی ہے۔ ذہین اور روشن آنکھیں عینک کے عقب سے چمک رہی ہوتی ہیں۔ چہرے پر کسی قسم کے ملال یا انقباض کا شائبہ تک نہیں۔ پتلے پتلے ہونٹ کپکپاتے ہیں۔ اور ایک باکمال گلوکار کی روحانی واردات سامعین کے کانوں کے واسطے سے ان کے دلوں تک جا پہنچتی ہے۔ کبھی کبھار جب وہ آواز کو جھلاتے ہیں اور خوبصورت بندش لگاتے ہیں تو ان کی بائیں آنکھ کے نیچے کا گوشت تھوڑی دیر کے لیے تلملاتا ہے۔ اس کے علاوہ گاتے وقت ان کے چہرے پر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ سہولت سے گانا کوئی برکت علی خان سے سیکھے!

گاتے وقت ہارمونیم ہمیشہ ان کے پاس ہوتا ہے وہ سُر منڈل کی بجائے ہارمونیم کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کو سنگت کا بہترین ساز سمجھتے ہیں۔ ریڈیو کے ایک بہت بڑے افسر سے اسی معاملے میں ان کی چخ بھی ہوگئی۔ انہیں جب کوئی بات نہ سوجھی تو یہ مشہور کر دیا کہ برکت علی خاں کی ترقی کا راز تو ہارمونیم ہے۔ اسی کا اعجاز ہے کہ وہ اتنی شہرت حاصل کر رہا

ہے۔ ورنہ اس کا گانا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سوچا کہ کسی طریقے سے اس ساز کو ہی اگر ریڈیو سے نکلوا دیا جائے تو برکت علی خان کو زک پہنچائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ سن سنا کے ہارمونیم کو ہی ریڈیو کے سازوں سے خارج کرا دیا۔ گویا جہاں مُرغ اذان نہیں دیتا وہاں دن ہی نہیں نکلتا۔ اسی روز سے ریڈیو سے اس ساز کا مقاطعہ ہو چکا ہے۔ لیکن خان صاحب نے اپنے دیرینہ دوست کو نہیں چھوڑا۔ نجی محفلوں میں جب بھی وہ گاتے ہیں۔ یہ ساز ان کا رفیق ہوتا ہے، وہ ان کی انگلیوں کے ذریعے ان کے دل کی بات سنتا ہے۔

اُن کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے۔ بہت سے ایسے گویے ہیں جنہوں نے بالواسطہ اُن سے اثر قبول کیا۔ اور اسی انداز کو اپنایا جو انہوں نے وضع کیا تھا۔ ان کے قول کے مطابق لتا اور نور جہاں تک ان کے قائم کردہ خطوط پر چل رہی ہیں۔ بھارت کے مشہور گلوکار محمد رفیع نے بھی ابتداء میں ان سے اور اُن کے بڑے بھائی غلام علی خان سے تعلیم حاصل کی۔ افضل حسین (جے پور والے) بھی اُن کے شاگرد ہیں۔ نواب ظہیر یار جنگ (حیدر آباد دکن) بھی اُن کو اپنا استاد مانتے ہیں اور اکثر حیدر آباد بلاتے رہتے ہیں۔

اس فنی عظمت کے باوجود غرور چھو تک نہیں گیا۔ دوسرے اعلیٰ فنکاروں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی عظمت کا اقرار کرتے ہیں۔ ورنہ اس میدان کے تقریباً سبھی شہسوار اپنے سوا کسی کی ہستی کو نہیں مانتے۔ سچے سُر کے گیان نے ان کو بہت زیادہ حلیم اور متواضع بنا دیا ہے اور ان کے دل میں موسیقی کے دیگر ماہرین کے لیے بے پناہ جذبہء محبت ہے۔ ان کے پسندیدہ گانے والوں میں چند ایک یہ ہیں۔ پنڈت سبھا سکر راؤ آنجہانی، بڑے غلام علی خان، روشن آراء بیگم، بیگم اختر، نور جہاں، لتا منگیشکر اور اقبال بانو۔ ساز سے بھی اُن کو بڑی محبت ہے کہ سوز ساز کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ اسی لیے سازندوں کی بھی وہ اتنی ہی قدر کرتے ہیں جتنی کہ گویوں کی۔ ولایت خان (ستار نواز) شریف پونچھ والے (ستار نواز)، بندو

خان (سارنگی نواز) نتھو خان (سارنگی نواز) ظہوری خاں (سارنگی نواز) اور حیدر بخش (سارنگی نواز) کے فن کے بڑے مداح ہیں۔

برکت علی خان اگرچہ کلاسیکل نہیں گاتے اور انہوں نے نیم کلاسیکی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی کو بام عروج تک پہنچایا ہے۔ پھر بھی بڑے بڑے خان صاحب جو کلاسیکی موسیقی سے نیچے بات تک نہیں کرتے، ان کو اسی طرح احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں جس طرح لائٹ گانے والے اُن کی قدر کرتے ہیں۔

استاد منور علی خاں

میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی میری بیوی خورشید نے فون اٹھایا۔ ''ہائے ہائے..... بڑا افسوس ہوا ہے'' کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے قدم فوراً رُک گئے۔ دو تین منٹ ہو گئے، میری بیوی نے فون رکھ دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ منفرد موسیقار بڑے استاد بڑے غلام علی خاں کے صاحب زادے منور علی خاں صاحب کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا ہے۔

یہ منحوس خبر سنانے والے، مشہور مبصر موسیقی موہن ناٹکرنی تھے۔ جو دو دن پہلے یعنی جمعہ کو بمبئی سے لندن پہنچے تھے اور سوموار کی صبح کو یہ خبر ہمیں سنا رہے تھے۔ دفتر پہنچتے ہی میں نے مہیش پٹیل کو فون کیا۔ جو اسی سال ان کے تین ریکارڈ نکال رہے تھے۔ انہوں نے افسردہ آواز میں اس سانحے کی تصدیق کی۔ ''ایوب بھائی حیدر آباد دکن سے متلیش امین (منور خاں کے شاگرد رشید) کا فون آیا تھا کہ خاں صاحب دس منٹ باتیں کرتے ہوئے عدم آباد سدھارے'' بقول یگانہ

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پانہ ملا

اور یوں اس خبر سے میری ۲۸ سال کی رفاقت، محبت اور اخوت کا خاتمہ ہو گیا جو کراچی، لاہور اور لندن کی ملاقاتوں، محفلوں اور مجلسوں کا مجموعہ تھی۔ ان کے سب عزیزوں،

دوستوں، اور شاگردوں اور احباب کو فرداً فرداً اطلاع دی۔

۱۱۳ اکتوبر (جمعہ کا دن) واقعی انہونی اور حسرت ناک خبر لے کر آیا۔ مجھے لاہور میں ۱۹۲۶ء کا زمانہ یاد آ گیا۔ میں ان کے چچا برکت علی خاں (مرحوم) کی خدمت میں پہنچا تو وہ فرمانے لگے۔ ''ایوب صاحب! آج کوئی بڑا اچھا گانا سناتے ہیں۔'' یہ محفل موسیقی آل پاکستان موسیقی کانفرنس والے حیات احمد خاں صاحب کے در دولت پر ہونی تھی۔ چنانچہ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ (جولاء کالج کے طالب علم تھے) برکت علی خاں صاحب کی معیت میں ڈیوس روڈ والے مکان پر جا پہنچا۔ وہاں دیکھا تو منیر احمد شیخ، موسیقی کے عاشق عنایت الٰہی ملک، ہر دربار کے راجہ، راجہ غضنفر علی خاں اور طلوع اسلام والے پرویز صاحب پہلے ہی موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد معلوم ہوا کہ بھارت سے استاد منور علی خاں صاحب اور استاد اللہ رکھا صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان کے اعزاز میں اس محفل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ابتدا مرحوم شریف خاں صاحب (پونچھ والے) کے ستار سے ہوئی۔ کیا خوبصورت اور سُریلا ساز بولتا تھا۔ ہر ہر سُر کے ساتھ شریف خاں صاحب کے چہرے اور جسم کی حرکتیں راگ کے تاثر کو جامعیت کے ساتھ ادا کر رہی تھیں۔ غالب کے اس مصرع کی تشریح اس روز ذہن میں آئی۔

تیرے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے

طبلے پر سنگیت خاں صاحب اللہ رکھانے کی۔ یوں لگتا تھا کہ دریائے موسیقی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہر بول برجستہ آ رہا تھا۔ میرے دماغ میں پھر غالب کا یہ شعر کوندا۔

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

اس عظیم دنگل کے بعد استاد منور علی خاں خیال سرا ہوئے، راگ ٹھمری، دادرا اور

کافیاں سنائیں۔ خواجہ فرید کی اس کافی نے آج مجاز سے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ آپ بھی سنئے۔ کیا عظیم لوگ تھے۔

شالا دوے پنناں موڑ مہاراں
موڑ مہاراں تے آگھر باراں
اُچے پڑے پئی کرلانواں
سد ماراں تے پا ہلا راں
لگ چٹھیاں سنجاں ول بھیجاں
تے میں بیٹھی کاگ اُڈاراں

(اس میں اردو کی ایک فرد لگائی

کعبے سے بُت کدے سے، کبھی بزمِ جام سے
آواز دے رہا ہوں تجھے ہر مقام سے

اس روز منور علی خاں ایسا جم کر گائے کہ باوجود اصرار کے استاد برکت علی خاں صاحب نے گانے سے انکار کر دیا اور فرمایا "میرا بیٹا اتنا اچھا گا گیا ہے۔ اب اور گانے کی گنجائش ہی نہیں۔" کیا منصف لوگ تھے۔

یہاں لندن میں بیسیوں ملاقاتیں ہوئیں۔ ۷۸ء میں یورپ کا دورہ کر کے آئے تو ہمارے ہاں ٹھہرے۔ روز مجلسِ شعر و موسیقی جمتی۔ ایک دفعہ تو مائک راؤ پوپٹکر آنجہانی طبلے پر سنگت کے لیے کافی دیر سے پہنچے تو میرے سُسر استاد اللہ رکھا نے خود سنگت کی اور بڑے مزے کی نشست رہی۔ اسکے بعد ۱۹۸۸ء میں لندن تشریف لائے۔ ان کی رہائش گاہ پر ہی میری برتھ ڈے کا انتظام مرحوم نے کیا۔ سارنگی نواز استاد سلطان خاں بھی اس محفل میں شریک ہوئے۔ خوب گپ شپ ہوئی۔ مرحوم کا شعری ذوق بھی بڑا پاکیزہ تھا۔ اپنے والد

صاحب کی طرح ہزاروں شعر انہیں یاد تھے اور ان کو برمحل استعمال کرتے تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے سودا کی مشہور رباعی پڑھی، سن کر پھڑک گئے۔ وجد کی سی حالت ہوگئی۔ آج جب وہ اس جہاں میں نہیں رہے یہ رباعی کس قدر صادق آتی ہے۔

سودا چپے دنیا تو بہر سو کب تک؟
آوارہ ازیں کوچہ ہاں کو کب تک!
حاصل یہی اس سے ناں کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تُو کب تک؟

استاد نزاکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں

مشہور زمانہ موسیقار استاد علاؤ الدین خاں نے مدت ہوئی میرے استفسارات کے جواب میں لکھا تھا۔ ''ہماری جانکاری کے اندر اچھے گانے والوں میں سے رام پور کے استاد مشتاق حسین خان صاحب اور پاکستان کے استاد بڑے غلام علی خاں صاحب اور وہیں کے آجکل کے استاد سلامت علی، نزاکت علی کے نام بتا سکتا ہوں استاد فتح علی خان صاحب پٹیالہ کے، تان رس خان گھرانے کے اچھے گانے والوں میں سے تھے اور اس گھرانے کے مرحوم استاد عاشق علی خاں صاحب بھی اچھے گانے والے تھے اور آج بھی اس گھرانے کے اچھے گانے والے ہوں گے میں ۹۶ برس کا ہو گیا ہوں۔ اس لیے پرانے وقت کی بات ہی بتا سکتا ہوں۔ آجکل کے لڑکوں کے نام میں نہیں جانتا۔ پنجاب سے آپ اگر پوچھ گچھ کریں تو آپ کو پوری جانکاری مل جائے گی''

یہ تھا بابائے موسیقی کے طویل خط سے اقتباس! آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ ڈاکٹر آف میوزک استاد خان صاحب علاؤ االدین خان کے محبوب اور پسندیدہ مطربوں اور موسیقاروں میں جہاں استاد عاشق علی خان مرحوم، استاد مشتاق حسین خان اور استاد بڑے غلام علی خاں مرحوم کے نام نامی آتے ہیں۔ وہیں استاد نزاکت علی خان، استاد سلامت علی خاں کے اسمائے گرامی بھی شامل فہرست ہیں۔

خان صاحب استاد نزاکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں شام چوراسی کے مشہور

دُھرپدی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔(ان کے جدامجد استاد چاند خاں، استاد سورج خاں ، دربار اکبری کے مشہور موسیقاروں اور سنگیت کاروں میں سے تھے جن کا تذکرہ آئین اکبری میں فاضل مورخ ابوالفضل نے کیا ہے) دُھرپد سے خیال وہ ایک ہی زقند میں گانے لگے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جو اسلوب، خیال کو انہوں نے بخشا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ لے اور سُر کا امتزاج، رچاؤ اور سبھاؤ جو ان کے گانے میں جھلکتا ہے وہ خال خال نظر آتا ہے اور سننے والا بار ہا یہ پکار اٹھتا ہے۔

آنکھوں میں آ کے کون الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے

مشہور مغنیہ رسولن بائی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نزاکت، سلامت تو فاتح ہندوستان ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے

نزاکت، سلامت، سلامت رہیں
یہاں پر رہیں یا وہاں پر رہیں

انہیں پاکستان کی حکومت کی طرف سے تمغہ صدارت Pride of performance موسیقی میں ان کے حسن کارکردگی کے صلے میں بھی مل چکا ہے شاہ ظاہر شاہ والیٔ افغانستان بھی ان کے مداحوں میں ہیں اور تمغۂ ہنر سے نواز چکے ہیں۔ روس، ہالینڈ، جرمنی، ناروے اور برطانیہ میں بھی ان کی نغمہ سرائی کا شہرہ ہے۔ یہاں تک کہ مشہور وائلن نواز یہودی مینوہن نے خود ہم سے درخواست کی کہ وہ موسیقی کے ان نابغوں اور بادشاہوں کو اپنے گھر میں سننا چاہتا ہے لیکن افسوس ہے کہ خان صاحبان اس کی یہ خواہش پوری نہ کر سکے کیونکہ انہیں اسی ہفتے واپس پاکستان تشریف لے جانا تھا۔

خان صاحبان کے والد صاحب کا نام استاد ولایت خان تھا۔ اس گھرانے کی یہ

برسوں کی ریت ہے کہ دو بھائی جوڑی کی شکل میں گاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے تایا احمد علی خان اور ولایت علی خاں اکٹھے گاتے تھے۔ سلامت علی خاں نے ۵ سال کی عمر میں اپنے والد سے موسیقی کی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ کہتے ہیں "باتوں ہی باتوں میں وہ موسیقی کے گُر ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ سُر فطری اور خداداد عطیہ ہے۔ لیکن لَے کا سبق لیا جاتا ہے ہمارے والد نے لَے کی اس طرح تعلیم دی کہ بچپن میں ہی لَے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ گئی۔"

ہربلبھ (جالندھر) کے میلے میں سب سے پہلے ۷ سال اور ۹ سال کی عمر میں بالترتیب پہلی محفل موسیقی میں انہوں نے حصہ لیا۔ اس سے پہلے ان کی عمر کے کسی بھی موسیقار نے اپنے فن کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ ہندو کہتے تھے کہ گویا خود بھگوان گا رہے ہیں۔ وہاں میاں کی ٹوڑی کا خیال متواتر ایک گھنٹے تک گایا۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ استاد سلامت علی خاں سخت بیمار تھے۔ اس لیے وہ اس میں حصہ نہ لے سکے۔ اس کے بعد چمپا نگر اور کلکتہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اومکار ناتھ ٹھاکر جیسے ودوان موسیقار نے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا کلکتہ جانے سے چند ماہ پہلے ان کے والد فوت ہوگئے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے نصیحت کی "بیٹا انسان کا پتہ نہیں کب وقت آجائے، لیکن ریاض اور مشق جاری رکھنا اور جہاں تک ہو سکے اپنے فن اور خاندان کا نام روشن کرنا۔"

ان کی وفات کے بعد انہوں نے جو کچھ بتایا تھا اس پر خاصی محنت کی اور جو کچھ ہم گاتے ہیں۔ ان کی تعلیم کا اعجاز ہے۔ سلامت علی خان نے مزید کہا "اس کے ساتھ ساتھ موسیقی کے لیے مختلف جگہوں پر گھومے پھرے۔ اچھے اچھے لوگوں کو سننے کا موقع ملا۔ رجب علی خاں صاحب دیواس والوں کو سُنا۔ خاں صاحب کرامت خاں، خاں صاحب فیاض حسین خاں کا گانا سُنا۔ پنڈتوں وغیرہ کو بھی سُنا پنجاب کے گویوں خاں صاحب عاشق علی خان، خان صاحب توکل حسین مشہور دُھرپدیوں کو سُنا اور ان کی صحبت میں بیٹھے اور یوں ہر

گھر سے فیض پایا''۔ تقسیم کے بعد ہم پاکستان آ گئے۔ یہاں اس وقت موسیقی کا اتنا چرچا نہیں تھا۔ حالات بڑے تاریک تھے۔ دو تین سال بڑی گمنامی میں بسر ہوئے۔ بعض لوگوں نے ہمارے متعلق عجیب عجیب باتیں بنائیں۔ لیکن ہم ریاض کرتے رہے۔ جو کچھ ہمیں آتا تھا۔ اس کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ دو تین سال کے بعد پروگرام شروع کر دیئے۔ پاکستان کے علاوہ باہر کے ملکوں میں بھی کافی چرچا رہا اور آج تک اس کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔''

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

ملکہ مُوسیقی، روشن آرا بیگم

پیدائش کلکتہ ۱۹۱۵ء وفات لالہ موسیٰ (پاکستان) ۶ دسمبر ۱۹۸۲ء

پاکستان سے ایک خط ڈائریکٹ ہو کر مجھے لندن میں ملا جو مجھے میری اکلوتی بہن شاہدہ یاسمین (اب مرحومہ) نے بھیجا تھا: نقل کرتا ہوں

۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء

لالہ موسیٰ (مغربی پاکستان)

محترم جناب محمد ایوب اولیاء صاحب، سلام مسنون

ان دنوں میری سوانح حیات لکھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اسی سلسلے میں سالہا سال کے جمع شدہ، دستاویزات، خطوط اور متفرق کاغذات کی پڑتال ہو رہی ہے۔

مذکورہ کاغذات میں آپ کا ۱۶ اگست ۱۹۵۸ء کا تحریر کردہ گرامی نامہ ملا ہے۔ جسے اس تالیف میں شامل کرنے کا ارادہ ہے تا کہ آپ جیسے صحیح فن شناسوں کی یاد باقی رہے۔ اسی خط میں آپ نے فرمائش کی تھی کہ میں آپ کو اپنا آٹوگراف ارسال کروں۔ کیونکہ، اب مجھے حتمی طور پر یاد نہیں کہ آپ کی یہ فرمائش میں نے پوری کر دی ہے یا نہیں۔ اس لئے اسی خط میں آپ کو اپنا آٹوگراف بھیج رہی ہوں خدا کرے یہ عریضہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے۔

والسلام

آپ کی خیر اندیش

روشن آرا بیگم

اس خط کی رسیدگی سے مطلع فرمائیں۔

یہ خط پڑھ کر مجھے ۱۹۵۸ء کا زمانہ یاد آ گیا۔ میں انیس بیس برس کا نوجوان طالب علم تھا۔ ہمارے انگریزی کے پروفیسر جناب مظفر علی سید تھے۔ وہ روشن آرا بیگم، اور زاہدہ پروین کی گائیکی کے بڑے قائل تھے۔ میں اکثر ان کو گھر پر بھی جا کے ملتا۔ ادب و شعر اور موسیقی کے مباحث ہوتے اور ریڈیو سے ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کا گانا سنتے اور محظوظ ہوتے۔ انہیں دنوں حکومت کی فن سے بے اعتنائی کی وجہ سے روشن آرا بیگم صاحبہ نے اعلان کر دیا کہ وہ ریاض اور مشق موسیقی چھوڑ رہی ہیں اور یہ خبر پاکستان ٹائمز لاہور میں چھپی۔ موسیقی کے متوالوں کو بہت رنج ہوا اور ملکہ موسیقی سے التجا کی گئی وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔ اسی جوش میں میں نے بھی ایک عریضہ مرحومہ کی خدمت میں بھیجا جو ان پر سوانحی کتاب میں چھاپ دیا گیا ہے۔

ستمبر ۱۹۵۸ء میں بی ایس سی کی تعلیم کیلئے لاہور کے ایف سی کالج میں داخل ہوا تو ملکہ موسیقی سے ریڈیو سٹیشن لاہور اور اوپن ائیر تھیٹر کے جشن موسیقی میں ملاقاتیں ہوئیں۔ کیا شفیق اور با اخلاق خاتون تھیں۔ بڑے لطف و کرم سے پیش آئیں۔ گاتے وقت ایسا لگتا جیسے کہ ایک نور کا ہالہ ان کے گرد رقص کر رہا ہے۔ سر اور لے کا ایسا حسین امتزاج اور رچاؤ، بہت کم سننے اور دیکھنے میں آیا ہے۔ تمہاری اور آمد بلا کی تھی۔ گھنٹوں جو گاتی تھیں اور ہم پھر بھی سیر نہیں ہوتے تھے۔

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ملکہ ترنم نور جہاں شعلہ آواز سے فلم بینوں کو ایک عرصے سے روشنی بخش رہی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ فلمی میوزک کا موجودہ طرز ادا کسی حد تک ان کا ممنون احسان ہے۔ لتا تک ان کے صوتی اظہار کی رطب اللسان اور خوشہ چیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔ مشہور گائیکہ نور جہاں نے مجھے صوتی اظہار سکھایا۔ میں ان سے صرف دو دفعہ مل چکی ہوں۔ پہلی بار جب ان سے ملی تو اس وقت مجھے بمشکل اردو زبان آتی تھی۔ دوسری دفعہ پاک و ہند کی سرحد پر صرف آدھ گھنٹہ ان کی صحبت میں گزارنے کا موقع ملا لیکن میں نے کئی کئی گھنٹے ان کے ریکارڈ سنے اور ان کے گانے کا مطالعہ کرتی رہی۔ لتا جیسی ملکوتی آواز اس سے عظیم خراج عقیدت کیا پیش کر سکتی تھی؟ یہ حقیت ہے کہ نور جہاں ہندو پاکستان کے سنگیت کی نابغہ روزگار شخصیت ہیں۔ تمام مروجہ راگوں اور راگنیوں کا انہیں پورا ادراک حاصل ہے اور راگ کی نبض اور روح کو بدرجہ اتم سمجھتی ہیں۔ حسِ جمالیات ان کی اس قدر تیز ہے کہ وہ معمولی بندش کو بھی اپنے حسنِ تخلیق سے شاہکار بنا دیتی ہیں۔ مشکل سے مشکل تان کو وہ اس قدر خوبصورتی اور سہولت سے ادا کر جاتی ہیں کہ باید و شاید کسی اور فلمی مغنیہ نے اس کا مظاہرہ کیا ہو۔ سر، لے اور تال کا حسین امتزاج ان کی مکمل گرفت میں ہے۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی ہیں۔

"جسے ہو شوق وہ آئے کرے شکار مجھے"

مدت ہوئی، وہ لندن آئیں، ایک ملاقات پر میں نے ان سے کہا کہ رات استاد

نزاکت علی خاں استاد سلامت علی خاں سے بڑا اچھوتا اور خوبصورت راگ سنا ہے۔ کہنے لگیں کون سا راگ؟ میں نے جواب دیا کوشک دھنی۔ ذرا توقف کیا اور پھر اس راگ کی استھائی، انترا، بڑی ترتیب سے گا کر سنا دیا۔ کہنے لگیں بچپن میں ہم نے بھی اس راگ کا سبق لیا ہے۔ مدت کے بعد اس کا اعادہ آج کیا ہے۔ ابھی حال ہی کی بات ہے ٹی وی سٹیشن پر کھڑے کھڑے، مرحوم ماسٹر غلام حیدر کی بات چھڑ گئی۔ کہنے لگیں کیا باکمال اور منفرد میوزک ڈایریکٹر تھے۔ میں نے بات بڑھانے کی خاطر ان سے پوچھا کہ یہ گانا کس راگ میں باندھا گیا ہے۔۔۔۔

سکھی ری نہیں آئے سجنوا۔۔۔۔(فلم گلنار)

کہنے لگیں راگ کھماج کا روپ سروپ ہے اور تلک کامود کو بھی اس میں برتا ہے۔ یہ کہہ کر فوراً اس کی بندش اونچے سروں میں بڑی بے تکلفی سے گانے لگیں۔ فن کے ساتھ یہ اخلاص بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

نور جہاں کا وطن مالوف قصور ضلع لاہور ہے۔ گایکی کے متوالوں کو قصوریوں نے لوٹ لیا ہے۔ خواہ وہ کالے خان (بڑے غلام علی مرحوم کے چچا اور استاد) ہوں یا بڑے غلام علی خاں، برکت علی خاں ہوں یا بشیر علی خاں ماہی نور جہاں یا منور علی خاں بڑے غلام علی خاں کے صاحب زادے) آواز کے ایک ہی وار سے گھایل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سریلا پن اور سنگیت کی شیرینی قصور کے گویوں پر ختم ہے۔

شعلہ نو انور جہاں ۲۱ ستمبر ۱۹۲۶ کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ چھ سات سال کی عمر میں بمقام کلکتہ پہلی دفعہ گانا گا کر سامعین کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ ۹ سال کی ہوئیں تو ہیر سیال

میں گانا گایا اور شہرت عام اور بقائے دوام کی مسند پر جا متمکن ہوئیں۔ اس وقت ہندو پاک فلمی صنعت میں سے اچھا گانے والی ہیں اور ملکہ ترنم کے لقب سے مشہور ہیں۔ بعض ہندوؤں کے نزدیک سرسوتی (سنگیت کی دیوی) نے دوبارہ جنم، نور جہاں کے روپ میں لیا ہے۔ ہلکی پھلکی موسیقی کے علاوہ کلاسیکی موسیقی کی بھی ماہر ہیں اور اس سلسلے میں انہیں ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم (مرحوم) اور استاد بڑے غلام علی خاں مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ بہترین مغنیہ کے علاوہ ایک بہترین اداکارہ بھی تھیں اور ہندو پاک کی متعدد فلموں میں اپنی اداکاری اور گلوکاری کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ ان کی مشہور فلمیں یہ ہیں۔ گاؤں کی گوری، انمول گھڑی، دوست، جگنو، انارکلی، خاندان (کہانی سید امتیاز علی تاج) گلنار، چن وے، دوپٹہ، انتظار، مرزا غالب، کویل۔ فلم نیند میں ٹھمری انگ میں گائی ہوئی یہ بندش آج بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

سانوریا۔۔۔۔۔۔چھن چھن باجے پایلیا

یاد رہے کہ ان کی سب سے پہلی فلم گل بکاؤلی تھی۔ فلم جگنو میں دلیپ کمار جیسا باکمال، عظیم اور منجھا ہوا اداکار نور جہاں سے دبا دبا نظر آتا ہے۔ جذباتی اور حزنیہ اداکاری میں بھی وہ لاثانی ہیں اور ملکہ ترنم کے ساتھ ساتھ ملکہ جذبات کہلانے کی مستحق ہیں۔

۵۹۔۶۰ کی بات ہے مجھے فلم مرزا غالب کے سیٹ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مرزا غالب کی یہ غزل نور جہاں پر پکچرائز ہو رہی تھی۔

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

اور جب وہ اس شعر کے پیکر میں ڈھلیں تو شعر و آہنگ و موسیقی اور اداکاری اپنے عروج پر تھی جو مرزا غالب کے ذہن و ادراک کی پہنائیوں میں موجزن تھی۔

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی، کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار، چھوٹا جائے ہے، مجھ سے

مرزا کا یہ شعر خود ایک متحرک تصویر ہے۔ اسے مزید حسن و توانائی بخشنا نور جہاں کا کام تھا۔ اور جب اس شعر کو نرت ہی کا لبادہ پہنایا تو غالب کے عظیم دکھوں کی صحیح ترجمانی اور تفسیر کر کے رکھ دی۔

ہوے ہیں پاوں ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جاے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جاے ہے مجھ سے

غالب اور فیض ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ آپ نے غالب کا ابھی ایک مصرع پڑھا۔ انہوں نے مصرعہ ثانی فوراً پڑھ دیا اور ایسے ایسے شعر آپ کو یاد دلائیں گی جو اس غزل میں نسبتاً غیر معروف تھے۔ مگر ان کی ادائیگی سے نئے مفاہیم اور معارف نکل آئیں گے، بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

فیض صاحب سے ان کے بڑے پرانے اور گہرے مراسم تھے۔ ان کی اس نظم کو گا کر انہوں نے لافانی بنا دیا ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبت، مرے محبوب نہ مانگ

نور جہاں نے تقریباً اپنے وقت کے سبھی عظیم میوزک ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کیا ہے۔ مرحوم ماسٹر غلام حیدر، (خاندان، گلنار) نوشاد (انمول گھڑی) سجاد حسین (دوست) مرحوم خواجہ خورشید انور (انتظار اور کویل وغیرہ) ماسٹر عنایت حسین (انارکلی) وغیرہ وغیرہ۔

ان کے پسندیدہ گویے استاد بڑے غلام علی خاں مرحوم، استاد برکت علی خاں مرحوم،

مرحومہ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم، لتا منگیشکر اور فریدہ خانم ہیں۔ فریدہ خانم کے بارے میں تو وہ یہاں تک کہتی ہیں کہ وہ غزل مجھ سے بہتر گاتی ہیں۔ اس سے زیادہ وہ حق شناس اور منصف مزاج اور کیا ہو سکتی ہیں۔

ہندو پاکستان کے بیشتر فنکاروں سے ان کے نہایت مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ ڈانسر ستارہ دیوی، دلیپ کمار، پران، لتا منگیشکر اور شیاما سے ان کے نہایت گہرے اور قریبی مراسم، آج تک برقرار ہیں۔ خود ان کا کہنا ہے۔

اقبال لکھنو نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

صدائے رفتہ ۔۔۔۔۔مختار بیگم

اس ''غیرت ناہید'' کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

قلم اس ''غیرت ناہید'' کے لیے داستاں طراز ہو رہا ہے جو برسوں آغا حشر موحوم کی ہم دم و دم ساز رہیں۔ آغا حشر نے اُن سے عورت کے احساسات و جذبات کی عکاشی کرنا سیکھا اور انہوں نے آغا حشر جیسے عظیم فنکار کو سمجھا اور فن کو سیقل کرنے میں ممد و معاون ہوئیں۔ زندگی کو دونوں نے ایک ہی زاویہ نظر سے دیکھا اور عمروں کا تفاوت، ذوق کی اکائی کو نہ دبا سکا، یہ دونوں عظیم المرتبت فنکار برسوں دُنیا کی اس وسیع جولانگاہ میں اکٹھے دوش بدوش چلے اور دُنیا کو دکھا دیا کہ اگر آغا حشر بہت بڑا ڈرامہ نگار اور نباضِ فطرت ہے تو مختار بیگم بھی ایک عالم و فاضل مغنیہ ہے جس کی آواز میں شعلے کی سی چمک ہے اور پانی جیسی روانی جس کی آواز میں آبشاروں کی گھن گرج اور وادیوں کا سا سکون ہے۔ غرض آغا حشر اور مختار بیگم لازم و ملزوم ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے جدائی اختیار نہ کی تا آنکہ زندگی نے آغا کو جُل دیا اور پھر پھول میں باس اور چاند میں جوت نہ تھی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

.....

مختار بیگم کا کہنا ہے۔ میری عمر بمشکل سترہ اٹھارہ برس ہوگی کہ کلکتہ میں آغا حشر موحوم سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میری باتوں سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے مجھے گریجوایٹ سمجھا، انہیں سخت دھچکا لگا جب اُنہیں معلوم ہوا کہ میرا Academic Career کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے بڑے عجز سے اعتراف کرلیا کہ کہ تم وہ پہلی ہستی ہو جس نے آغا حشر کے تجربات کو غلط قرار دیا ہے، ورنہ اور کسی سے میں کب مات کھانے والا تھا۔۔۔ اُن کی اس صاف بیانی سے میں ازحد متاثر ہوئی۔ میرے دل میں اُن کے لیے یک گونہ دلبستگی پیدا ہوگئی۔ وہ بھی مجھ میں خاص دلچسپی لینے لگے۔۔۔

کسی بزرگ نے کہا ہے ع

"عشق اول در دِل معشوق پَیدا می شود"

بارہ چودہ برس کی طویل رفاقت کے بعد میں آج تک تجزیہ نہیں کرسکی ہوں کہ اس "عشق" کی تحریک میری طرف سے ہوئی تھی یا آغا کی طرف سے۔۔۔ بہر کیف پہلی ملاقات سے جو یگانگت استوار ہوگئی وہ اُن کی وفات تک نہ صرف برقرار رہی بلکہ موت کے بعد تو وہ دو چند ہوگئی، اولیں ملاقات کا تاثر کبھی زائل نہ ہوسکا۔

پہلی ملاقات کے چند روز بعد مجھے پیٹ کے درد کی شکایت ہوئی اور فیصلہ قرار پایا کہ مجھے آپریشن کرالینا چاہیے، دل نے کہا کہ آپریشن سے پہلے آغا کو تو مل لو معلوم نہیں پھر ملنا ہو کہ نہ ہو۔ یہ خیال مجھے کشاں کشاں آغا کی رہائش گاہ تک لے گیا۔ مگر وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے لیے پیغام چھوڑ دیا کہ ہسپتال میں آکر مل جایئے، کیونکہ

مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو
آج دل کھول کر گلے مل لو

رقعہ پڑھتے ہی آغا صاحب دوڑے ہوئے ہسپتال آئے۔ دیر تک میری دلجوئی کرتے رہے۔ جب نرس مجھے ٹرالی پر لٹا کر آپریشن روم کی طرف لے جانے لگی تو انہوں نے بڑی لجاجت سے نرس کو کہا اگر برا نہ مانیں تو مجھے ٹرالی لے جانے دیجیے۔ نرس اس بوڑھے شخص کی بات کو کیسے مسترد کر سکتی تھی جس نے تھیٹر کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ آپریشن روم کے دروازے پر پہنچ کر آغا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور بڑے حزن و یاس سے خدا حافظ کہا۔ عزیزوں سے معلوم ہوا کہ جب تک آپریشن ہوتا رہا۔ آغا بڑے اضطراب سے کمرے کے باہر ٹہلتے رہے۔ ان دنوں آپریشن سے پہلے کم بخت کلوروفارم سنگھائی جاتی تھی جس سے گھنٹوں بعد قے اور ابکائیاں آتی رہتی تھیں۔ آغا میری Vomiting سے خاصے پریشان نظر آتے تھے۔ جب میں قے کرتی تو ان کا دل چاہتا کہ وہ خود اٹھ کر صاف کر لیں۔ لیکن اُنکی فطری انا اُن کے آڑے آتی تھی، میں یہ بات ان کے بشرے سے تاڑ گئی اور انہیں مخاطب کر کے کہا کہ آغا صاحب! عشق کیجیے یا اپنی خودی کو سنبھالیے، جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر ڈر کاہے کا۔ آغا صاحب یہ سن کر خفیف سے ہو گئے۔ مگر میرا مقصد صرف اور صرف بے تکلفی پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے بھی میری اس گستاخی کا برا نہ مانا۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میں آپ کو ان کی کون کون سی بات بتاؤں وہ تو ایک بحر زخار تھے جس کا احاطہ کرنا زبان قلم سے بڑا مشکل ہے میں آج صبح سے کل صبح اور کل صبح سے قیامت تک اُن کے متعلق بیان کرتی رہوں تو پھر بھی میرا جی سیر نہیں ہوگا۔۔۔ مگر سُناؤں تو کسے سُناؤں۔ ذوق بدل

رہے ہیں طبیعتیں کچھ سے کچھ ہو رہی ہیں۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار کو دیمک چاٹ رہی ہے اور نئی پود اپنے بزرگوں کے نام سے واقف نہیں۔ فن کے پجاری گئے، اب نہ فنکار ہیں نہ فن کے پہچاننے والے، اندھوں میں کانے راجے بہت ہیں مگر علم و فن کی صحیح چاٹ بہت کم لوگوں کو ہے، آج کل فن کم ہے اور ملمع سازی زیادہ۔ فنون لطیفہ کے اصلی شیدائی نہ رہے جن کے پاس کچھ ہے وہ خانہ نشین ہو کر اپنے فن کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

جو لوگ تھیٹروں کا فرنیچر اٹھایا کرتے تھے وہ آج ڈائریکٹر بنے بیٹھے ہیں۔ کیمرہ قلی، کیمرہ مین بن گئے۔ معمولی سازندے میوزک ڈائریکٹر ہیں اور جنہیں گلاس تک سنبھالنا نہیں آتا تھا وہ بزعم خویش اداکار ہیں۔ چند برسوں میں یہ کیسا انقلاب آ گیا ہے۔

چمن میں بلبل و گل کا نشان تک نہ رہا
ہوا بدل گئی دو روز میں گلستاں کی

جس نے آغا حشر کی آنکھیں دیکھی ہوں وہ کیونکر ''ٹٹ پونجیوں'' کو سراہ سکتا ہے وہ آغا جو بیک وقت فلسفی، لسان، زبان دان، مناظر، ڈرامہ نگار اور شاعر تھا جس کے سامنے بڑے سے بڑا مقرر اور حراف پانی بھرتا تھا، جو گالی دینے پر آتا تھا تو میر جعفر زٹلی کی روح وجد میں آتی تھی، ڈرامہ لکھتا تھا تو شیکسپیئر یاد آتا تھا، لفظ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے اور اس کے بہترین نقاد کون تھے اس کے معمولی ملازم، آغا کے سب دوستوں نے ایک ڈرامے پر واہ واہ کی۔ انہوں نے اپنے ایک نوکر کو سنایا۔۔ وہ منہ بنا کر بولا'' آغا! اس میں پھورس (Force) نہیں ہے''۔ آغا نے اسی وقت پھاڑ دیا اور نئے سرے سے لکھوانا شروع کر دیا۔ اس آغا حشر کو میں آپ کیسے بھول سکتے ہیں جس کا ذہن اپنی تمام تر بے قاعدگیوں کے باوجود اس قدر مربوط تھا کہ وہ بیک وقت کامیڈی اور ٹریجیڈی لکھانے پر قادر تھا۔ میں اس محبوب ہستی کے کیوں نہ گن گاؤں جس کو میں نے عمر بھر چاہا، چاہنے کے

بعد سمجھا اور سمجھنے کے بعد مزید چاہا، جس کی خاطر میں نے جوانی کو تیاگ دیا، امنگوں اور ولولوں کو دبایا۔ اٹھارہ سال کی البیلی لڑکی نے پچاس سال کے بڈھے کے ساتھ عمر بھر کا پیمان باندھا اور ہم دونوں نے اس میں رتی بھر کوتاہی نہ کی۔ میں نے آغا حشر اور اس کے فن کو چاہا اور آغا نے مختار بیگم کو۔ میری اور آغا حشر کی زندگی ''ایثار و وفا'' دو لفظوں سے عبارت ہے۔

ماضی کی یادوں کے دریچوں میں سے جب میں جھانکتی ہوں تو آغا کی باتوں کے پھول آج بھی معطر اور سدا بہار دکھائی دیتے ہیں، گوناگوں دلچسپیوں، متنوع تفریحات کا خیال آتا ہے تو دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ میں کس سے گفتگو کروں۔ آغا سے مقابلہ کرتی ہوں تو سب گنگ نظر آتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کھنڈروں میں رہ رہی ہوں جو نہ میری زبان سے واقف ہیں نہ میرے احساسات سے آشنا۔۔۔ ایام رفتہ یاد آتے ہیں تو آغا کا ذہین و فطین چہرہ یاد آجاتا ہے اور بے اختیاری میں آنکھوں کے چشمے ابلنے لگتے ہیں

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

یہ درست ہے کہ آغا کی بیشتر زندگی رندی و سرمستی میں گزری، اگر آخر عمر میں وہ تائب نہ ہوتے تو بھی ان کی اسلام سے بے پناہ شیفتگی اور رسول ﷺ سے مثالی عقیدت اُن کی بخشش کے لیے کافی ہوتی۔ اُن کا سینہ اسلام کی روشنی سے منور تھا۔ ان کی معرکہ آراء اسلامی نظمیں اس پر شاہد ہیں کہ ان کے دل میں اپنے مذہب کے لیے بڑا درد تھا جب بھی وہ کسی مذہبی جلسہ میں تقریر کرتے تو ان کی حریت انگیز مذہبی معلومات سے بڑے بڑے علماء انگشت بدنداں رہ جاتے۔ جوانی میں بلانوش ہوتے ہوئے بھی وہ بڑے سے بڑے مناظروں سے گتھ جاتے تھے اور انھیں پچھاڑ کر ہی دم لیتے، ایسے ایسے لطیف نکتے پیدا کرتے کہ جگادری اور پیشہ ور مناظر چوکڑی بھول جاتے۔

''موت سے کس کو رستگاری ہے''۔۔۔آخر ایک نہ ایک دن مالک حقیقی کے سامنے سب کو جواب دہی کے لیے حاضر ہونا ہے۔زندگی سے آغا کی ہمیشہ آویزش رہی اور ہر دفعہ کامیاب ہوئے۔لیکن موت کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور وہ عدم آباد سدھارے جہاں سے واپس آنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ہر شخص دنیا میں ہزاروں غم کھاتا ہے لیکن بعض دکھ دل و دماغ پر دائمی طور پر مسلط ہو جاتے ہیں، یہ اختیاری نہیں ہوتا ہے دل کی آواز ہوتی ہے جو اہل دل ہی سن سکتے ہیں۔میرے دل پر آغا کی موت نے جو نقش چھوڑا تھا وہ آج بھی تازہ ہے۔یہ پھانس تمام عمر نہ نکل سکے گی

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی
دل دیا غم سے آشنائی کی

میرے جسم کا رُواں رُواں اُس قابل تعظیم ہستی کی مغفرت کے لیے آمین کا الف بنا کھڑا ہے۔۔۔

خُدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے
ایں دعا از من و از جُملہ جہاں آمین باد

بنارسی مغنیہ۔۔۔۔۔رسولن بائی

رسولن بائی ۱۹۰۵ء میں بڑے مرزا (یوپی) کے ایک دیہات مجوا میں پیدا ہوئیں۔

والد کا نام صبا الرحیم ہے جو کہ داروغہ تھے۔ والدہ کا نام عدالت بی بی ہے جو خود بھی بڑا اچھا گاتی تھیں۔ ان کی بڑی بہن بتولن بھی اپنے وقت کی بہترین گانے والی تھیں۔ موسیقی میں رچے بسے اس ماحول میں رسولن بائی نے آنکھیں کھولیں۔ ماں نے اپنی بچی کا زیادہ دنوں تک بیکار رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی پانچ چھ برس کی عمر تھی کہ موسیقی کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ خان صاحب شمو خان صاحب بنارسی (سارنگی نواز) آپ کے استاد مقرر ہوئے جو بڑے منے خان کے شاگرد تھے اور شوری میاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جن سے ٹپے کی ایجاد منسوب کی جاتی ہے۔

ایام طفولیت سے ہی گانا ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ وہ خود کہتی ہیں، بچپن ہی سے گانے کے علاوہ ہمارا کوئی اور شوق نہ تھا۔ گانا ہی ہمارا کھیل تھا۔ گانا ہی ہماری گڑیاں تھیں۔ غرض گانا ہی ہمارے لئے سب کچھ تھا۔ خدا بخشے اماں ہماری اس معاملے میں بڑی سخت تھیں۔ وہ مجھے اور بہن بتولن کو رات کے دو بجے جگا دیتیں تھیں کہ اٹھو کب تک سوتی رہوگی، اور ہمیں گانے پر لگا دیتی تھیں۔ پھر صبح تک کیا مجال ہے جو آنکھ بھی جھپکے، وہ اپنے پاس بید کی چھڑی رکھتی تھیں، اور ذرا سی غلطی پر مار مار کر ہلکان کر دیتی تھیں۔ ان کی تربیت اور سخت گیری ہی کے طفیل ہم لوگ ٹون ٹان کر رہے ہیں۔ ادھر گھر پر ہر وقت گانے کی تلقین ہوتی رہتی تھی، ادھر

باہر کے لوگ چین نہیں لینے دیتے تھے۔ سودا سلف لینے کیلئے ذرا گھر سے باہر قدم رکھا ہے کہ کسی نے پکڑ لیا ہے، اور کہا کہ دو پیسے دینگے فلاں دادرا سنا دو، اور ہم گانا شروع کر دیتے۔ اس ماحول میں ہوئی ہے ہماری تعلیم.....!

دوسری چیز جس نے ہمارے ذہن کو کھولا اور گلے کی رگوں تک ظائم کیا ہے، وہ ہے استادوں کی خدمت آج کی دنیا میں استاد کی خدمت کوئی کیا کرے گا۔ ساری ساری رات استاد کو دبایا جارہا ہے۔ آنکھ کے اشارے پر ان کا حکم بجالا رہے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ شاید استاد کسی وقت خوش ہو کر اپنی کوئی اچھوتی چیز عنایت کر دیں جو ہمارے موسیقی کے علم میں اضافہ کر سکے اور ہم دنیا کو کوئی نئی چیز سنا سکیں.....استاد بڑے خوش ہوئے تو بلایا اور ایک آدھ سرگم یاد کرادی۔ ہم رٹتے رہے۔ اس کے بعد استاد ہمیں اور ہماری تعلیم کو بھول گئے۔ چار ماہ بعد پھر یاد فرمایا، آموختہ سنا اور نیا سبق دیا۔ پھر وہ سبق ہم اتنا یاد کر لیتے تھے، گویا زبان پر لکھ دیا جاتا تھا!

اب لوگ ہمارے پاس گانا سیکھنے کیلئے آتے ہیں اور چھوٹتے ہی کہتے ہیں، بائی جی ہمیں دو ماہ میں گانا سکھا دو۔ لو میاں اور سنو گانا کوئی ستو تھوڑی ہے کہ گھول کر پلا دیں۔

رسولن بائی پورب انگ میں ٹھمری گانے کیلئے مشہور ہیں۔ ٹھمری کے ہر گائیک نے آپ سے اثر قبول کیا ہے، اور پوربی انداز کیلئے آپ سے بالواسطہ یا بلا واسطہ استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ آپ کی مدت کی بھری خوشی بھیرون کی ٹھمری سن کر، گویے کان حاصل کرتے ہیں۔ جس کے بول یوں ہیں:

جا میں تو سے نا ہیں بولوں.....

جیا کی بات پیا میں تو سے نہ کہوں

جس اچھوتے پیرائے میں یا ٹھمری گائی گئی ہے، وہ انداز بہت کم لوگوں کو حاصل ہے

اور شائد رسولن بائی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔ جس طریق سے وہ ان دو مصروں کو ادا کرتی ہیں، وہ انہی کا حصہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دو مصروں میں سارے جہان کی شعریت، موسیقیت اور جذباتیت ملفون ہے۔ محبوبہ اپنے محبوب کو شکوہ آمیز انداز میں ناز و ادا دکھا رہی ہے۔ جس میں شکائتوں کا طوفان ہے، جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ برھا کی ماری محبوبہ کو جب اس کے ساجن ملتے ہیں تو ایشیا کی اس سادہ و معصوم رادھا کے پاس صرف ایک ہی حیادار اور پاکیزہ شکوہ ہے جو تمام تر محبت و الفت سے معمور ہے وہ اس لمحے یہی کہے گی.....

اے میرے ساجن! میں تم سے ہرگز نہ بولوں گی اور اپنے دل کی بات تم سے متعلق نہ کہونگی (کہ تم نے مجھے اپنے رویے سے پریشان کیا ہے)۔

ان پریم بھرے بولوں کو بتانے کا حق رسولن بائی نے ہی ادا کیا ہے۔ اب جبکہ کوئی اور مغنیہ یہ ٹھمری گاتی ہے تو حتی الامکان اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اسلوب رسولن بائی کا ہی ہو۔ حتیٰ کہ بھرت، مقامات اور خاص ''جگہیں'' بھی وہی ہوں، جو رسولن بائی کے تین منٹ کے ریکارڈ میں اسیر ہیں۔

ان کے قول کے مطابق ٹھمری میں کئی راگوں کا امتزاج ہوتا ہے، لیکن رنگ چوکھا اور بھرپور اسی راگ کا ہوتا ہے، جس میں کوئی ٹھمری دراصل کمپوز کی گئی ہوتی ہے، صرف بانکپن اور تنوع پیدا کرنے کیلئے دوسری راگنیوں کی آمیزش کی جاتی ہے، لیکن اس کے لئے قرینہ اور سلیقہ درکار ہے جو بہت کم موسیقاروں کے حصے میں آیا ہے۔

دوسری چیز جو رسولن بائی سے مختص سمجھی جاتی ہے، وہ ہے پوربی دادرا۔ اس میں بھی انہوں نے اپنی جدت طبع اور خلاق ذہن سے وہ رنگینیاں بھر دی ہیں جو انہیں پر موقوف ہیں، ایک تو آواز نکھری، نتھری اور نستعلیق، اس پر پورب انگ مستزاد! یہ سب چیزیں مل ملا کر ایسے

نغمے کو جنم دیتی ہیں جو مدتوں سننے والوں کو موسیقی کی پر فضا اور بہار پرور وادیوں میں گلگشت کی خاطر لئے جانا چاہتا ہے، جس کا کوئی انت نہیں اور نہ کوئی انجام۔ دوام اور ابدیت ان وادیوں کا حصار کئے ہوئے ہیں، جہاں بو در دشانتی موسیقی کے نام سے راج کرتی ہے...... اتنا گایا ہوا یہ دادرا کیا ہمیں بھی احساس نہیں دلاتا ہے؟......

بیکل جیا ہووے رام!
تم رے کارن بیکل جیا،
گھر سے میں نکسوں آنگن بھئی ٹھاری،
بہے پرویا آنچرا اڑی جائے رام!
تم رے کارن بیکل جیا......

رسولن بائی اس دادرے میں پہلے جیت کلیان کی پھرت کرتی ہیں۔ اس کے بعد ٹھمری کی شکل بنا دیتی ہیں۔ اس طرح دادرے اور ٹھمری کے اختلاط سے ایک حسین اور نرالے دادرے کی تشکیل کی ہے۔

تیسری چیز جو ان کو دوسرے فنکاروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے، وہ ہے ٹپہ گائیکی، جس میں دلچسپ انداز میں آپ ٹپہ گاتی ہیں، وہ آپ پر ہی ختم ہے۔ یہ واحد فنکارہ ہیں جو ایک مخصوص طرز ٹپہ کی ادائیگی کرتی ہیں۔ رسولن بائی کے بیان کے مطابق ٹپہ شوری میاں کی ایجاد ہے، جو بنارس کے رہنے والے تھے۔ لیکن پنجاب میں رہنے کی وجہ سے ان کی زبان کچھ پنجابی زدہ ہو گئی تھی۔ بیشتر ٹپے انہیں کی تصنیف ہیں۔ کرم، جو ان کے بھائی تھے، انہوں نے بھی چند ٹپے لکھے ہیں۔ گویا ٹپہ میاں شوری کے گھر سے ہی نکلا ہے۔

ٹپہ پنجابی ساربانوں کا گیت ہے۔ زبان زیادہ تر پنجابی ہی استعمال کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں سرحدی نقوش بھی ملتے ہیں۔ ادائیگی میں بھی سرحد کی موسیقی کبھی کبھار جھلکتی ہے۔

شمس کنول اپنے مضمون ''علم موسیقی'' میں ٹپہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ پنجاب کا پسندیدہ گانا ہے شوری نے اس کو اور زیادہ آراستہ کر کے بالکل نیا بنا دیا ہے۔ گو یہ طرز ذرا مشکل ہے، مگر کافی پر لطف ہے۔ ڈی مئی جوشی اپنے مضمون ''ہلکی ہلکی موسیقی'' میں لکھتے ہیں، ٹھمری اور دادرے کے مقابلے میں ٹپہ زیادہ مقبول نہیں ہے۔ ٹپہ پنجاب کے لوک گیتوں سے نکلا ہے، جنہیں شتر بان گایا کرتے ہیں۔ ٹپہ عام طور سے درمیانی لے کے ساتھ اک وائی نال میں گایا جاتا ہے۔ ٹپہ کے اکثر بول پنجاب زبان میں ہیں اور انہیں شوری میاں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ٹپہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک خاص قسم کی چھوٹی چھوٹی تانیں لی جاتی ہیں۔

ملکہ پکھراج کا کہنا ہے کہ ٹپہ ٹھمری گانے میں بہت زیادہ مدد دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولن بائی کا ٹھمری کا انداز سب سے الگ اور منفرد ہے۔ اس کے ساتھ فنی اشکال بھی پایا جاتا ہے۔ جو ٹپے کی خصوصیت اور دین ہے۔ اسی لئے خیال اور غزل گائیک ہوتے ہوئے بھی رسولن بائی کا ٹپے، ٹھمری اور دادرے کی گائیکی میں کوئی ہمسر نہیں (میری رائے میں خیال کا صرف ایک ریکارڈ خیال ملتانی رسولن بائی کا مشہور ہے۔ محفلوں میں عموماً وہ خیال نہیں گاتیں۔)

بعض پرانی ادبی کتابوں میں بھی ٹپے کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً صاحب طلسم ہوشربا کا مصرع ہے،

ٹپہ، ٹھمری، غزل، ترانہ

انشاء اللہ خان انشا کہتے ہیں.....

اس رمز کا بیان سنشا گون ہے بھلا

اب بھیرویں کا ٹپہ کوئی آپ گایئے

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسولن بائی غزل اور خیال نہیں گاتیں، صرف دادرا، ٹھمری اور ٹپہ گاتیں ہیں۔ ان پر ہی انہوں نے اپنی تمام محنت صرف کی ہے اور ان کو رفعت آسمان بخشی ہے۔ وہ خود بڑے فخر سے کہتی ہیں۔ جس چیز کا ریاض کیا ہے، اس کے دانے دانے کر کے دیکھ لیجئے، صحت اور سچائی نظر آئے گی۔"

مجھے ۱۹۶۱ء میں ان کی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ میوزک کانفرنس کے سلسلے میں لاہور آئی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ اپریل کی بات ہے، اوپن ایئر تھیٹر میں کانفرنس کا پہلا روز تھا، اور محفل بہار تھی۔ ہر گویا راگ بہار ہی پیش کر رہا تھا۔ سازندے بھی راگ بہار کو مختلف شکلوں میں پیش کر رہے تھے۔ ایک ناٹے قد کی بڑھیا دیکھنے میں آئی جس کے دودھ ایسے بال اس کو اور بھی زیادہ معزز بنا رہے تھے۔ ہنستی ہوئی آنکھیں اس کی ذہانت و ذکاوت کی چغلی کھا رہی تھیں۔ مخول ٹھٹھا اس کی عادت ثانیہ معلوم ہوتا تھا۔ بات بات پر مسکراتیں، خوبصورت جملوں میں بھبتیاں کستیں۔ یہ محترمہ تھیں..... رسولن بائی..... پورب انگ کی با کمال مغنیہ..... جو ملکہ موسیقی روشن ارا بیگم کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنی دلچسپ باتوں سے انہیں بہلا رہی تھیں۔ اتنے میں اناؤنسر کی گرجدار آواز گونجی کہ..... صاحب راگ بہار پیش کرتے ہیں۔ محفل ہمہ تن گوش ہوگئی۔ انہوں نے گانا شروع کیا، شائد اس قسم کے بول تھے..... آئی بہار.....

پتہ نہیں اس روز ان کو کیا ہو گیا یا وہ موڈ میں نہیں تھے، خاصا بے ہنگم گائے۔ رسولن بائی اور روشن آرا بیگم کانا پھوسی کر رہی تھیں اور مسکرا بھی رہی تھیں۔ میں ان کے بالکل پیچھے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جرأت کی اور آگے کھسک کر رسولن بائی سے کہا، "بائی جی! جب بہار آ جائے تو مجھے بھی بتا دیجئے گا" یہ سن کر دونوں خواتین کھلکھلا کر ہنس پڑیں، اور رسولن بائی نے جواب دیا، میاں! یہاں خزاں تو آ سکتی ہے لیکن بہار آنے کا سوال تک پیدا

نہیں ہوسکتا۔اور یوں میرا ان کا ''زبردستی'' تعارف ہوا۔اس روز کی نشست ختم ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے لاہور ہوٹل میں ملنے کی تاکید کردی۔

دوسرے روز لاہور ہوٹل پہنچا تو ان کے کمرے میں ایک باریش جوان ملے۔بعد میں پتہ چلا کہ یہ رسولن بائی کے بھانجے ہیں اور علم دینیات وتصوف سے انہیں گہرا لگاؤ ہے۔ان سے معلوم ہوا کہ بائی جی باتھ روم میں ہیں۔وقفوں کے دوران کبھی کبھار کوئی ٹپہ گنگنانے کی آواز بھی سنائی دیتی۔یہ رسولن بائی ہی غسل خانے میں گا رہی تھیں۔باہر نکلیں تو مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا ابھی وہ رسمی علیک سلیک سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ روشن آرا بیگم،ان کے میاں چوہدری صاحب اور فلم سٹار نور جہاں کے خاوند مسٹر اعجاز بھی آ گئے۔مادام نور جہان نے ان کے اعزاز میں کوئی دعوت دے رکھی تھی۔انہیں وہاں جانا تھا۔رسولن بائی مجھ سے معذرت کرنے لگیں۔میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں میں پھر آ جاؤنگا۔مجھ سے پوچھا کہ کہاں جاؤنگا۔میں نے جواب دیا کہ ایف سی کالج چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا اور گلبرگ مارکیٹ میں اتر گیا۔

غالباً تیسرے یا چوتھے روز میں پھر لاہور ہوٹل شام کے وقت پہنچا۔اس روز میوزک کانفرنس میں انہیں گانا تھا۔چنانچہ مجھے بھی رکنے کو کہا۔جب اوپن ائیر تھیٹر سے گاڑی انہیں لینے کے لیے آئی،تو مجھے بھی ہمراہ لے لیا۔تھیٹر کے ویٹنگ روم میں پہلے سے اختری بائی، مختار بیگم وغیرہ بیٹھی ہوئی تھیں۔رسولن بائی بھی یہیں بیٹھ گئیں۔یہاں ایک بڑا مزیدار لطیفہ ہوا۔خان صاحب استاد سردار خان کہیں سے ادھر آ نکلے۔اختری بائی فیض آبادی اور مختار بیگم تعظیماً کھڑی ہوگئیں اور خان صاحب سے بغل گیر ہوکر ملیں لیکن رسولن بائی لاتعلق ہوکر چپ چاپ بیٹھی رہیں۔اختری بائی (بیگم اختر) کی رگ تفنن پھڑکی۔انہوں نے خان صاحب کو جب مخاطب کرتے ہوئے رسولن بائی کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''خان صاحب! اس بڑھیا

سے بھی مل لیجیے کہ حسرت نہ رہ جائے۔"

اتنے میں سٹیج پر رسولن بائی کو بلاوا آ گیا۔ اس روز انہوں نے ٹپہ سنایا، ٹھمریاں سنائیں، دادرے پیش کیے اور جی بھر کر اہل لاہور کی تواضع کی۔ گو اُن کی آواز زیادتی عمر کی وجہ سے بیٹھ سی گئی ہے لیکن بانکپن اب بھی موجود ہے اور وہ طنطنہ جوان کی آواز میں مستور ہوتا تھا، اس کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔

ایک اور ملاقات میں رسولن بائی نے پنجاب کے گویوں کی بڑی تعریف کی۔ پنجاب کے گویوں کی آواز اور سوز سے بڑی مرعوب ہیں اور ساتھ ہی ان کو نصیحت کرتی ہیں کہ وہ اپنے انگ (سٹائل) کی حفاظت کریں، اور کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس لحاظ سے مرحوم برکت علی خان کی وہ بڑی مداح ہیں۔

وہ نئے کلاسیکی گانے والوں کی بھی معترف ہیں، لیکن ان کے متعلق ایک بات سے بڑی ناخوش ہیں کہ ان میں تہذیب کا فقدان ہے۔ اس پر وہ ایک واقعہ سنانے لگیں کہ یہاں کی ایک بڑی اچھی گانے والی لڑکی کا گانا سننے کا موقع ملا۔ جب وہ گا چکی تو میں نے اس کی بلائیں لیں، دُعائیں دیں اور اس کے گانے کی بڑی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بیٹی تم تو بڑا اچھا گاتی ہو، تو وہ جواباً کہنے لگی "جی ہاں....." ۔ رسولن بائی کہنے لگیں اب آپ ہی بتایئے کہ یہاں اس جملے کا محل تھا؟

آخری بار وہ مجھے کراچی میں ملیں۔ غالباً دو اڑھائی ماہ کے لیے انڈین ہائی کمشنر کی دعوت پر آئی ہوئی تھیں۔ اُن کے استاد شکور خان (سارنگی نواز)، کرامت خان (طبلہ نواز) بھی تھے۔ عابدی صاحب کے ہاں محفل جمی۔ سب سے پہلے شکور خان نے سارنگی کی دھیمی دھیمی آنچ سے دلوں کو گرمایا۔ اس کے بعد کرامت خان نے طبلے پر مختلف تالوں اور توڑوں کو پیش کیا۔ کرامت خان کے فن میں سب سے نمایاں چیز جو مجھے معلوم ہوئی وہ ان کا طبلہ

بجانے کا انداز ہے جو منفرد بھی ہے اور البیلا بھی۔ اس میں گھن گرج بھی ہے اور ملائمت بھی۔

المختصر رسولن بائی ہماری تہذیب و معاشرت کا ایک اہم ادارہ ہے۔ ایک روایت ہے۔ انہوں نے سرد و گرمِ زمانہ کو خوب دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فنی و علمی رست گاہ میں تہذیبی نقوش بھی بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ وہ روتوں کو ہنسا نہ سکیں تو کم از کم روتوں کے ساتھ روتی ضرور ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک ہزار پہلو درس گاہ ہے، جس سے انہوں نے صرف گانا ہی نہیں سیکھا۔ لوگوں کے ساتھ رہنا بھی سیکھا ہے۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونا بھی ان کی تعلیم میں شامل تھا۔

رسولن بائی ان چند بزرگ ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے بعد سُر تو سننے میں آئے گا لیکن صداقت اور پاکیزگی خال خال نظر آئے گی۔ آواز کا رچاؤ اور گلے کا سوز تو حاصل ہوگا لیکن اس پر خلوص کی دیرینہ تہہ میسر نہیں ہوگی اور موسیقی کا ہر مشتاق ان کی آواز کو ترسے گا۔

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

امر سہگل۔۔۔۔کندن لال سہگل

کے ایل سہگل، گرجدار، کھری اور سریلی آواز کے حامل تھے۔ان کی آواز کی سچائی، تپش، سوز وحلاوت کا ایک زمانہ قائل ہے حیرت ہوتی ہے کہ دنیائے موسیقی کے یہ دو بڑے موسیقار ۴ اپریل کے دن پیدا ہوئے۔ میری مراد استاد بڑے غلام علی خان اور کندن لال سہگل سے ہے۔ غلام علی خان صاحب کی تاریخ پیدائش ۴ اپریل ۱۹۰۲ء ہے جبکہ سہگل کی ۴ اپریل ۱۹۰۴ء ۱۸ جنوری ۱۹۴۷ء کو ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ یعنی ایک اور چار کا ہندسہ انہیں مل گیا۔ ۴۔۴۔۴۔۴ عجیب اتفاق ہے کہ چار کا عدد چار بار آیا ہے۔ جبکہ غلام علی خاں صاحب کے حصے میں ۲ بار ۴ کا ہندسہ آیا ہے۔ یہ حقیقت ماننی پڑتی ہے کہ ان دونوں ہستیوں کا علم موسیقی پر احسان عظیم ہے۔ بڑے غلام علی خاں صاحب کلاسیکی موسیقی کے انمول رتن تھے جبکہ سہگل فلمی اور عام فہم موسیقی کے دُرِ بے بہا تھے۔

جموں نے تین چار بڑے فنکار پیدا کئے ہیں۔ ماسٹر جھنڈے خاں صاحب، ملکہ پکھراج، طبلہ نواز استاد اللہ رکھا اور کندن لال سہگل۔ مگر سہگل میں یہ خوبی تھی کہ بن سیکھے وہ فن وتخلیق کی انتہائی بلندی پر پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ جب وہ استاد فیاض خاں صاحب کے پاس شاگردی کیلئے گئے تو انہوں نے فرمایا میں تمہیں اور کیا سکھا سکتا ہوں۔ تم اپنے فن کی حدت سے خود ہی کندن بن گئے ہو اور منزل نے تمہیں خود پا لیا ہے۔ اتائی ہوتے ہوئے بھی انہیں راگوں اور تالوں کا پورا پورا ادراک اور جانکاری تھی۔ شنکرا باگیشری جھنجھوٹی دیش، بھیرویں، دیوگندھاران کے محبوب راگ تھے۔ راگ دیوگندھار جتنا خوبصورت راگ

ہے۔اس کا رواج اتنا ہی کم ہے۔ خان صاحب استاد عبدالکریم خان صاحب کے بعد کندن لال سہگل نے اس راگ کو خوبصورتی سے اور دل جمعی سے گایا ہے۔ تالوں میں کہروا ۴ ماترے ۶/۸ ماترے اور تین تال، ۱۶ ماتروں کا برتاؤ ان کے ہاں اکثر ملتا ہے۔ چونکہ خود شاعر تھے۔اس لئے اُستاد شعراء کا کلام اور وہ بھی منتخب اور چنیدہ غزلیات کو گایا۔ مرزا غالب، استاد ذوق، امیر مینائی، اکبر الہ آبادی سیماب اکبر آبادی۔ علامہ آرزو لکھنوی، بیدم وارثی کے کلام کو نہایت موثر اور دل پذیر انداز میں گایا ہے۔ میری پسندیدہ غالب کی غزل ''وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے''۔ ولے مجھے تپش دل، مجال خواب تو دے'' پہلے پہل انہوں نے ہی ریکارڈ کروائی۔ اور بعد ازاں استاد برکت علی خاں صاحب نے بھی اپنے منفرد اور استادانہ انداز سے گا کر غالب کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کر دیا..... مرحوم سہگل کا شعری ذوق اس قدر اعلیٰ اور نفیس تھا کہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر، اُردو ادب کے حکیم فرزانہ، مرزا غالب مرحوم کی غزلیں سب سے زیادہ گائیں اور ریکارڈ کرائیں۔ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے پر مبنی فلم ''یہودی کی لڑکی'' میں غالب کی غزل:

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

سب سے پہلے گائی۔ میرے اتالیق اردو اور محسن استاد حافظ حاجی احمد مرحوم کہا کرتے تھے کہ سہگل نے علامہ اقبالؒ کا کلام بھی نجی محفلوں میں گایا ہے۔ خصوصاً ان کی بے مثل غزل سے

کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

مگر اس کو ریکارڈ نہ کرا سکے۔

فارسی زبان میں صائب تبریزی اور میرزا قتیل کی غزلیں بڑے خوبصورت انداز میں گائیں۔ سہگل بے استادے تو تھے ہی مگر بے پیرے نہیں تھے۔ اُن کے مرشد حضرت سلمان

یوسف تھے۔ ان کے فیضان نظر سے سہگل فن موسیقی میں جدید طرز کے صاحب اسلوب فنکار بن گئے گویا:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
مرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

مرشد کے ہاں سے انہیں فنی بصیرت اور سوزِ دل ملا۔ اُن کے ہاں جو تڑپ، کسک اور سپردگی ملتی ہے وہ انہیں حضرت کا تحفہ ہے۔ ۴۲ سال کی مختصر عمر میں انہوں نے فلمی گائیکی کی عظیم بلندیوں کو چھولیا اور اپنے وقت کے سپر اور میگا سٹار کہلائے۔ دیوداس، تان سین، سٹریٹ سنگر، لگن چندی داس، شاہجہان اور پروانہ جیسی کامیاب فلمیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ غزل میں ان کا مقام وہی ہے جو مرحومہ بیگم اختر کا ہے۔ ان دونوں نے اپنی فنی مہارت سے لاکھوں دلوں کو مسحور کرلیا اور آج بھی اہل ذوق اُن سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے نغمات سدا بہار ہیں۔ اساتذہ فن کی گائی ہوئی چیزوں کو نئی زندگی اور نیا چلن دیا۔ فیاض خاں صاحب کی گائی ہوئی بھیرویں ٹھمری "بابل مورا نیہر چھوٹو ری جائے، کو گا کر اس کو نئی عظمتیں بخشیں۔ شنید ہے کہ یہ ٹھمری شاہِ اودھ واجد علی شاہ کی تصنیف ہے۔ راگ دیو گندھار بہت کم فنکاروں نے گایا ہے۔ استاد عبدالکریم خاں صاحب اور سہگل نے اس خوبصورت راگ سے صحیح انصاف کیا ہے۔ (جھولنا جھلاؤ) انہیں خاں صاحب کی گائی ہوئی دوسری بندش راگ جھنجھوٹی میں "پیا بن ناہیں آوت چین" آج بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے اس کو اپنے ملکوتی انداز میں گا کر اپنی عظمت کا سکہ منوالیا ہے۔ راگ دیش کی بندش

"دُکھ کے دن اب بیت ناہیں"

میں ان کی اپنی زندگی کا پورا دکھ اور کرب سما گیا ہے۔

اساطیری راگ دیپک میں "دیا جلاؤ جگمگ دیا جلاؤ" میں اپنی پوری استعداد اور جذباتی، جمالیاتی احساسات کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُن کے ہاں درد و کرب اور محرومی، نا آسودگی

کا عنصر اس قدر غالب ہے کہ آخر کوان کی میکشی و میخواری اس قدر بڑھی کہ ۴۲ سال کی عمر میں اپنے آبائی شہر جالندھر میں انتقال کیا۔

اختر شیرانی مرحوم کی طرح ان کا بھی یہی نعرہ تھا

پئے جا پلائے جا خوب ساقی!

کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی

چھلک جائے نہ مینائے دو عالم

ہمارا ہاتھ ہے اور زلف ساقی!

نامعلوم شاعر

رنگین تراز حناست بہار و خزان ما | بر دست خویش بوسہ زند باغبان ما
ما محصم رازے راہ تواضع کنیم دوست | بیرون گرز زے تیرکشی راغبان ما
چوں بید گرچہ تیغ زبانیم سربسر | بندے شدست بے ثمری بر زبان ما
از بال و پر غبار تمنا فشندہ ایم | بر شاخ گل گراں نہ بود آشیان ما

شاعر: مرزا قتیل

مارا بہ غمزہ کشت و قضا بہانہ ساخت | خود سوئے ما نہ دید و حیارا بہانہ ساخت
رفیم بمسجدے کہ ببینیم جمال دوست | دستے برخ کشیدہ و دعارا بہانہ ساخت
زاہد نہ داشت تاب جمال، پری خاں | کنج گرفت و یادِ خدا بہانہ ساخت
از بال و پر غبار تمنا فشندہ ایم | بر شاخ گل گراں نہ بود آشیان ما

ہولی ہو برج راج دلارے

ابراہیم ذوق

گر سیاہ بخت ہی ہونا تھا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

کیدار شرما حسرت	پنچھی رے کاہے ہوت اداس شمع کا جلنا ہے یا سوزش پروانہ ہے سنو سنو ہے کرشن کالا
کندن لال سہگل	میں بیٹھی تھی ، ہم جولیوں میں
لال داس	ہری بن کوئی کام نہ آئے

کندن لال سہگل کی گائی ہوئی غزلیں اور گیت:

شاعر	غزل/گیت
بیدم وارثی	اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے غمزہ پیکان ہوا جاتا ہے
سیماب اکبر آبادی	اب کیا بتاؤں میں تیرے ملنے سے کیا ملا عشق خود مائل حجاب ہے آج اے بے خبری دل کو دیوانہ بنا دے جلوہ گاہِ دل میں مرتے ہی اندھیرا ہو گیا جاگ اور دیکھ ذرا عالم ویراں میرا دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں بقدری شوق اقرار وفا کی شکرہ ہستی کا لیکن تم نے یہ کیا کر دیا

غالب

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
ابن مریم ہوا کرے کوئی
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ہر ایک بات میں کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

آرزو لکھنوی

ادھر پھر بھی آنا ادھر جانے والے
گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے
بہت اس گلی کے کیے ہیرے پھیرے
متوالے اپنے سے جو گھٹا جھوم پڑی ہے

امیر مینائی

ایک پہلے درد نے......کون ویرانے میں دیکھے گا

نہ معلوم شاعر

کیسے دن اور کیسے دن
کون بجھاوے رام تین میرے من کی
جن جاؤری گوری بنیا آج، بنیا بھرن
جھولنا جھلاؤ

فریدہ خانم

تقسیم ملک کے بعد کا واقعہ ہے۔ بستر مرگ پر ایک نحیف ونزار بوڑھا شخص لیٹا ہوا ہے۔ صرف سانس کی آمدورفت سے زندگی کے آثار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی کشادہ پیشانی سے اس کی خوش بختی اور ذکاوت طبع مترشح ہے۔ آنکھوں میں بلا کی کشش اور تیزی ہے، جو زمانے کے تفکرات اور بیماری سے قدرے دُھندلا گئی ہے۔ یہ آدمی مشہور کلاسیکی موسیقار اُستاد عاشق علی خان ہے جو نزع کے عالم میں ہے۔ سب کی سن رہا ہے لیکن اپنی نہیں کہہ رہا ہے۔ جس نے سارے پنجاب اور ہندوستان میں گائیکی اور راگ داری سے تہلکہ مچا دیا ہے اور اپنے منفرد اسٹائل سے پنجاب کے تمام گویوں کے انداز موسیقی کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ جس کی آواز میں وہ شان و جبروت اور طنطنہ ہے کہ گویے اس کے نام سے مرعوب ہیں اور اس کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ فقیر شہنشاہ موسیقی، ایک شفیق استاد موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اس کے عزیز واحباب، شاگرد وغیرہ اس کی چارپائی کے گرد جمع ہیں۔ ہر کوئی اس کو مخاطب کر رہا ہے لیکن وہ کسی کو جواب نہیں دے رہا۔ آخر مختار بیگم ان کو آواز دیتی ہیں۔ ''خاں صاحب، ہم سے آپ نہیں بولتے تو یہ آپ کی مرضی ہے لیکن بچی کا گانا تو سُن لیجیے۔'' ایک بارہ تیرہ سال کی دھان پان سی لڑکی جس کا ناک نقشہ بڑا تیکھا ہے۔ ''اجازت'' لے کر راگ مالکوس پیش کرتی ہے۔

استہائی: کوئلیا بولے، امبوا کی ڈاری، کوئل کوک سُنائے

انترا: دادر مور پپیہا بولے، مجھ برہن کا جیارا ڈولے

پیا بن چین نہ آئے، کوئلیا بولے۔۔۔۔

یہ خیال اس بچی نے کچھ اس خوش اسلوبی اور مہارت سے گایا کہ تمام محفل میں ایک زندگی سی آگئی اور بوڑھا گائک جو جانکنی کی حالت میں تھا شدت جذبات اور آواز کے تاثر سے کانپتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ مختار بیگم نے بڑھ کر پوچھا "خاں صاحب! آپ کی شاگرد کیسا گاتی ہے؟ خاں صاحب کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے رونق آگئی اور کہا "سبحان اللہ" اس کے بعد اس عظیم موسیقار نے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

یہ بچی مختار بیگم کی چھوٹی بہن تھی جس کا نام اردو کے مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر مرحوم نے فریدہ خانم رکھا۔ فریدہ خانم کا آبائی وطن امرتسر ہے لیکن ان کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ والد کا نام میاں غلام محمد ہے۔ جو خود بھی ہارمونیم میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

ابھی یہ سات سال ہی کی تھیں کہ ان کو خاں صاحب عاشق علی خاں کا شاگرد کرا دیا گیا۔ تیرہ چودہ برس کی عمر تک خاں صاحب سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ خاں صاحب نے بالکل اپنے بچوں کی طرح ان کو علم موسیقی کا درس دیا۔ وہ ان کو کھیلتا ہوا دیکھتے تو کہتے۔ "فریدے، آپتر۔ دو چار پلٹے تو سُنا۔" فریدہ اُن کے بالوں سے معرا سر پر دھول جما کر بھاگ جاتیں۔ آخر خاں صاحب اُن کو راہ پر لے ہی آتے کہ بیٹے آ سبق سُنا۔ پھر میں پکچر دکھانے لے جاؤں گا اور یہ مان جاتیں۔ پھر مشکل سے مشکل مقام اس قدر روانی سے سنا دیتیں کہ مرحوم کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اسی صحیح اور باقاعدہ تعلیم کا اعجاز ہے کہ اچھے سننے والے بھی بعض اوقات ان کی آواز پر دھوکا کھا جاتے تھے کہ یہ روشن آراء کی گائیکی ہے یا فریدہ خانم کی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ باقاعدہ ریاض کرتی تھیں۔ درمیان میں وہ لوگوں کا رجحان کلاسیکی موسیقی کی طرف سے کم دیکھ کر بددل ہو گئیں اور ریاض ترک کر دیا اب

جب کہ یہ فن عوام میں مقبول ہو رہا ہے۔ انہوں نے پھر ریاض شروع کر دیا ہے جو موسیقی کے لیے نیک فال ہے۔ اُن کی آواز میں اس قدر چڑھاؤ آ گیا ہے کہ سنتے ہی بے اختیار مومن مرحوم کا یہ مصرع یاد آ جاتا ہے۔

اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

گانے والوں میں جس طرح اُن کے استاد کی راگ داری مختلف اور منفرد تھی۔ اسی طرح خواتین گلوکاروں میں ان کا انداز بالکل نرالا اور دلکش ہے۔ تقسیم ملک کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ریڈیو کے جشن موسیقی میں حصہ لیا۔ بڑے غلام علی خاں بھی اس میں شریک تھے۔ آپ نے غالب کی یہ غزل آنندی دھن میں گائی۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

دُھن کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ادائیگی اس قدر دلفریب ہے کہ آدمی گھنٹوں سنتا رہے اور سر دُھنتا رہے۔ آج بھی جب یہ غزل ریڈیو سے نشر ہوتی ہے تو سامعین کو شعر و موسیقی کی دوندیوں کے حسین امتزاج کا اس قدر شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ سوچے بنا نہیں رہ سکتے کہ اس کے سُنگم پر ایک باہوش مغنیہ نغمہ زن ہے اور وہ فریدہ خانم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ غالب نے شاید یہ فریدہ خانم ہی کے لیے کہا تھا۔

ساقی بہ جلوہ، دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزن تمکین و ہوش ہے

فریدہ خانم کو تقریباً تیس ۳۰ راگوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اُن کی خصوصیات لَے بدلنا (لے کاری) مشکل تانیں اور سُریلا پن ہے ان کے استاد عاشق علی خاں بھی جو پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ لے کاری اور مشکل تانوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خیال، ٹھمری، غزل،

گیت یکساں مہارت سے گاتی ہیں۔اُن کے نزدیک مشکل راگ دلیکار، بھوپالی، کیدارا، درباری اور اڑانا ہیں۔ایمن کلیان، کامود، پوریا دھناسری اور مالکوس (اُن کے پسندیدہ راگ ہیں۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ سنگیت میں آپ نے کن کن گویوں سے اثر لیا ہے۔تو وہ مسکرا کر کہنے لگیں۔ ''یہ سوال تو ٹیڑھا ہے۔ بہرکیف بتانا تو پڑے گا ہی۔مختار بیگم، استاد بڑے غلام علی کاں اور استاد برکت علی خاں کی گائیکی سے میری گائیکی کافی متاثر ہے۔ ''اُن کے پسندیدہ گانے والے روشن آرا بیگم، بڑے غلام علی خاں اور استاد امیر خاں اندور والے ہیں۔نیم کلاسیکی موسیقی میں اختر بائی فیض آبادی، رسولن بائی پسند ہیں۔فلمی موسیقی کے فن کاروں میں نور جہاں، لتا منگیشکر اور گیتا رائے کو پسند کرتی ہیں۔اُن کے پسندیدہ سازندے شریف پونچھ والے، حبیب علی خان (بینکار) صابری (سارنگی نواز)، استاد ولایت خاں (ستارنواز) اور علی اکبر (سرودنواز) ہیں۔

شروع میں فلموں میں بھی حصہ لیا تھا۔لیکن اس سے ریاض کے لیے کافی وقت نہ ملتا تھا۔اس لیے یہ مشغلہ ترک کر دیا۔فلم ''سیلاب'' میں فریدہ خانم نے صبیحہ کے بالمقابل اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ صبیحہ خانم ان کے سامنے دبی دبی سی ہیں۔

غرض فریدہ خانم کے فن میں نزاکت، ندرت، پاکیزگی، رعنائی اور دلفریبی ہے جو انہیں کا حصہ ہے۔بہت سی اور بھی خواتین موسیقار ہیں۔مگر۔ع

یہ رُتبہ، بلند ملا جس کو مل گیا

ان کی گائیکی ایک مصفا اور شیریں چشمے کے مانند ہے جس میں ترنم، نغمگی اور بادہ شبانہ کی سی جدت ہے۔ جہاں موسیقی کے پیاسے اپنی پیاس بُجھا سکتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

صُوفی خُدا بخش۔۔۔۔عطائی گویا

کون یقین کرسکتا ہے کہ پہلوانوں کے خاندان میں بھی کوئی نامی گرامی گویا پیدا ہوسکتا ہے۔ گویے تو خاندانی گویوں کو بھی ایک مدت کے بعد گائیک مانتے ہیں آپ کو ایک ایسے فنکار سے متعارف کراتا ہوں جس نے بیس سال کی عمر میں خان صاحبوں سے اپنا فن منوایا اور عطائی ہونے کے باوجود اپنے علم سے ہم چشموں کے دل میں گھر کرلیا۔

کٹڑہ کرم سنگھ (امرتسر) میں کئی کشمیری خاندان کے ایک فرد خلیفہ دین محمد پہلوان رہا کرتے تھے پیشہ ساری عمر پہلوانی ہی رہا۔ خلیفہ صاحب نواب صاحب ڈھاکہ کے ملازم تھے اور اُن کی عمر کے آخری ایام ڈھاکہ میں گزرے۔ ان کے ہاں ایک سرخ وسپید صحتمند بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام انہوں نے خدا بخش رکھا۔ باپ اپنے بیٹے کی غیر معمولی صحتمندی دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ یہ بچہ اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے گا اور کشتی کے فن میں اپنا خاص مقام پیدا کرے گا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ خدا بخش جب ذرا بڑے ہوئے تو اپنے والد کے ساتھ ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں کشتی کا فن اپنے باپ سے ہی سیکھنا شروع کردیا اور بارہ برس کی عمر میں کافی استعداد اس فن میں بہم پہنچائی۔ کئی دنگل ہوئے، کشتیاں لڑیں، اور کشتی میں خوب خوب اپنے ہاتھ دکھائے۔ صوفی صاحب کا کہنا ہے کہ سوائے اکھاڑے کے ڈھول سے ہی تال اور لے کاری سیکھ چکے تھے۔ تحت الشعور میں موسیقی نے اپنا گھر بنالیا تھا۔ بارہ برس کے ہوئے تھے کہ اچانک ان کے ابا بیمار ہوئے اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ صوفی کے

لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ خاندان میں کوئی اور کمانے والا بھی نہ رہا اور نہ ہی اتنا اثاثہ یا اندوختہ تھا کہ ان کے جوان ہونے تک کفالت کر سکے۔ خود صوفی ابھی پہلوانی میں خام تھے۔ آخر یہی صلاح ٹھہری کہ واپس امرت سر چلا جائے۔ لیکن یہاں بھی جب کوئی پرسان حال نہ ہوا تو پریشانی نے مہذب آوارہ گردی کی شکل اختیار کر لی۔ بے مقصد گلی کوچوں میں گھومتے رہتے۔ شادی بیاہ میں برات کے ساتھ ساتھ جاتے گویا بینڈ کی آواز کا سحر انہیں ساتھ چلنے پر مجبور کرتا۔ امرت سر میں عالمگیر بینڈ والا اپنے فن میں یکتا تھا۔ یہ عموماً اسی کے بینڈ سے زیادہ مست ہوتے۔ عالمگیر نے دیکھا کہ یہ لڑکا ہر برات کے ساتھ ہوتا ہے جب برات منزل مقصود تک پہنچتی ہے تو واپس چلا جاتا ہے۔ اس کے دل کو اس بچے کی یہ بات بڑی بھائی چنانچہ اس نے ایک دن صوفی کو روک لیا اور ادھر ادھر کی باتیں پوچھیں۔ بس پھر کیا تھا دونوں میں دوستی ہوگئی، صوفی کہتے ہیں کہ عالمگیر کلانٹ ایسی بجاتا تھا کہ کوئی کیا بجائے گا۔ وہ پُر تاثیر نغمے آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ موسیقی کا پہلا باقاعدہ لیکن بے استاد سبق شاید وہی تھا۔۔۔

عالمگیر، خورشید موسیقی بھائی لال کا شاگرد تھا۔ جو پنڈت بھاسکر راؤ آنجہانی کے شاگرد تھے۔ جب صوفی اور عالمگیر کی گاڑھی چھننے لگی تو صوفی نے اس سے پوچھا کہ آپ اپنے استاد سے بھی تو کبھی ملایئے۔۔۔ عالمگیر نے کہا۔ "ہاں کسی روز اُن سے ملنے چلیں گے۔۔ بھائی لال (جنہیں اُن کے شاگرد باؤ جی سے خطاب کرتے ہیں) ان دنوں کولمبیا کمپنی میں ملازم تھے صبح کو لاہور جاتے اور شام کو واپس امرت سر چلے آتے۔ ظاہر ہے چھٹی کے روز ہی ان سے مل سکتے تھے۔ ایک روز عالمگیر نے صوفی سے آ کے کہا کہ کل باؤ جی لاہور نہیں جا رہے ملنے کے لیے تیار رہنا۔ ملنے والے دروازے میں بھائی لال کی بیٹھک پر جا پہنچے۔ جہاں ان دنوں ان کا سکول تھا۔ بھائی لال اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے۔ البتہ

ان کے بڑے صاحبزادے خلیفہ نثار علی عرف نتھ بیٹھے تھے۔ بالکل نوعمر تھے۔ دبلے پتلے، دھان پان سے علیک سلیک کے بعد یہ دونوں بیٹھ گئے۔ صوفی صاحب کا خلیفہ نتھ سے تعارف ہوا۔ صوفی کی ہیت کذائی دیکھنے کے قابل تھی۔ مُنڈا ہوا سر، بدن پر ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور تہمد خلیفہ نتھ نے جو اس وقت صرف ۱۴ برس کے تھے، عجیب نظروں سے صوفی کو دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ''اس مسخرے کا یہاں کیا کام!'' ادھر ادھر کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بھائی لال بھی آ گئے۔ اپنے شاگرد عالمگیر سے ملنے، اچانک صوفی پر نظر پڑی تو زیرِ لب مسکرائے اور کہا۔۔ ''یہاں آپ کا کوئی جوڑ نہیں نکلے گا''۔۔۔۔۔ عالمگیر اور صوفی کی فرمائش پر بھائی لال نے جوگیا اساوری سنایا۔

بھائی لال نے یہ خیال اس انداز میں گایا کہ صوفی صاحب مدتوں بے چین رہے اور موسیقی کا جنون تیز تر ہوتا گیا ہر وقت خیال کے بول کانوں میں گونجتے رہتے اس پر بھائی لال کی پرسوز اور دردانگیز آواز! اکھاڑے کے ڈھول نے سنگیت کا جو روگ دیا تھا۔ وہ روز بروز بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ خلیفہ نتھ سے بھی یارانہ محکم ہوتا گیا۔۔۔

ایک روز صوفی صاحب بیٹھک کے پاس سے گزر رہے تھے کہ کسی کے گانے کی آواز سنائی دی خواہ مخواہ دل کو ڈسے جا رہی تھی۔ ان کے پاؤں کسی نامعلوم طاقت کے زیر اثر سیڑھیوں تک جا پہنچے۔ سیڑھیاں طے کر کے جب اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خلیفہ چھوئی موئی بنے آنکھیں بند گانے میں ہمہ تن محو ہیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ گویا خود راگ کی صورت بنے بیٹھے ہیں۔ صوفی کہتے ہیں۔۔ ''میرا بھی دل بھر آیا۔ جب وہ گانا ختم کر چکے تو دیر تک مجھ سے بات نہ ہو سکی۔ آخر میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھا۔'' میں اس وقت حاضری دے سکتا ہوں جب آپ شاگردوں کو تعلیم دے رہے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ اس طرح صوفی کامل تین سال تک ہر روز خلیفہ نتھ کے درس

میں حاضر ہوتے رہے۔اس طرح انہیں ''راگوں'' کی کافی معلومات حاصل ہوگئیں۔ابھی تک انہوں نے باقاعدہ سیکھنا نہیں شروع کیا تھا۔صرف خداداد ذہانت سے اتنا کچھ حاصل کرلیا کہ وہ سنگیت کو سمجھ گئے تھے۔اب صرف آواز لگانے کی دیر تھی!

صوفی صاحب کہتے ہیں کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہی خلیفہ نتھ استادی کا درجہ حاصل کر گئے اور وہی شاگردوں کو راگ ودیا سمجھاتے تھے۔ بھائی لال نے انہیں بالکل اجازت دے رکھی تھی۔محفل میں بڑے اطمینان، سکون اور اعتماد سے گاتے تھے اور کبھی کسی بڑے گویے سے نہیں دبتے تھے۔ایک دفعہ ربائیاں والی گلی میں محفل جمی۔استاد عاشق علی خان جیسے عظیم گویئے بھی تشریف رکھتے تھے۔خلیفہ نتھ نے خان صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔۔''خان صاحب'' ذرا غور سے سنئے۔

خلیفہ نتھ اور صوفی صاحب کی دوستی اس حد تک بڑھی کہ ایک روز جھوٹا دودھ پی کر بھائی بھائی بن گئے۔کن رسیا تو پہلے ہی تھے، اب اخوت کی ڈوری میں پروئے گئے۔

باتوں باتوں میں علم موسیقی کی تحصیل ہونے لگی۔ بھائی چارے نے بے تکلفی پیدا کردی۔پھر کوئی راز راز نہ رہا۔موسیقی کے تمام اسرار و رموز صوفی صاحب کے سینے میں چلے گئے۔جس محبت اور پیار سے نتھ سمجھاتے۔وہ بھی صوفی کے دل پر نقش ہے پھر کسی غیر کے در پر جانے کی ضرورت تمام عمر محسوس نہ ہوئی۔

ایک دن ہنس کر نتھ نے صوفی سے کہا کہ بھائی اب آواز بھی لگاؤ، کنگال تو ہمیں تم کر ہی چکے!!!اس روز سے باقاعدہ گلے کی تعلیم شروع ہوئی، میاں کی ٹوڑی تلواڑے میں پہلے خود سنائی۔پھر صوفی کو بھی ساتھ ملالیا۔۔ان دو منہ بولے بھائیوں کی حالت یہ تھی کہ گا رہے تھے اور رو رہے تھے۔اتنا گایا، اتنا روئے کہ گھگھی بندھ گئی۔دونوں نے ایک دوسرے کے دل کی حرارت محسوس کی۔جس میں کہ دونوں جل رہے تھے۔

تعلیم کا سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ اسی دوران میں بھائی نتھ بیمار ہوئے۔ صحت ان کی پہلے بھی اچھی نہ تھی اس پر اتنا ریاض۔۔۔ نتھ کی کمزور صحت اسے برداشت نہ کر سکی۔ جب بیماری نے طول کھینچا تو ڈاکٹروں نے مرض لاعلاج قرار دے دیا اور کہہ دیا کہ اس لڑکے نے فن کے لیے جان ماردی ہے۔ اس کے پھیپھڑے بالکل سکڑ گئے ہیں۔ بھائی لال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا اتنا لائق بچہ موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ قدرت کی کتنی ستم ظریفی تھی۔ صوفی کہتے ہیں ''ایک نامعلوم جذبے کے تحت میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے گھر لایا گیا۔ دوسرے دن سناؤلی آ گئی۔ میرے لیے وہ قیامت کا روز تھا۔ میں پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا دھاڑیں مارتا شہر سے باہر نکل گیا۔

اس حادثہ کے بعد صوفی کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو گئی۔ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ سارا دن دشت خواری اور اپنے عزیز بھائی کے غم میں گانا مشغلہ رہ گیا۔ نتھ کی موت نے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی۔ آخر عزیزوں اور بھائی لال کے سمجھانے سے ان کی حالت کچھ بدلی۔ پھر بھی سارا دن بھائی لال کی بیٹھک میں گم سم بیٹھے اور ریاض میں مشغول رہتے۔ اپنے منہ بولے بھائی کے عطیہ کو کیسے ضائع کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ بیٹھک میں استغراق کی حالت میں درباری گا رہے تھے کہ بھائی لال آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے اوپر پہنچے۔ صوفی صاحب نے پاس ادب سے گانا بند کر دیا۔ بھائی لال کو یقین نہ آیا کہ یہ صوفی گا رہے تھے حیرت رفع کرنے کی خاطر پوچھا کہ یہ آپ ہی گا رہے تھے، اثبات میں جواب پا کر بڑے خوش ہوئے اور آواز لگانے کے مختلف طریقے بتائے۔ اس طرح صوفی صاحب کو بھائی لال نے اپنی شاگردی میں لے لیا اور باقاعدگی سے راگ سنگیت سکھانا شروع کیا۔ وہ بالکل اپنے بچوں کی طرح ان کے سر پر دست شفقت پھیرتے اور دل و جان سے موسیقی کی مشکل سے مشکل اور عجیب سے عجیب چیزیں بتاتے۔ صوفی نے بیس سال کی عمر تک کسی بڑی

مجلس میں نہیں گایا۔ ''خان صاحب'' عطائی ہونے کی وجہ سے انہیں درخور اعتناء نہ سمجھتے۔ بلکہ پھبتیاں کستے کہ اس کو دیکھو کشمیری پہلوان ہو کر گویا بننا چاہتا ہے۔ صوفی یہ طنزیہ فقرے سنتے اور بچ رہتے کیوں کہ استاد سے ابھی اجازت نہیں ملی تھی کہ وہ کسی عام محفل میں گائیں۔ خدا خدا کر کے آخر اجازت مل ہی گئی۔ اب موقع تھا کہ وہ اپنے علم و فضل سے خاندانی گویوں کا منہ بند کر سکیں۔ اسکول کے صحن میں نامی گرامی گویے بلائے گئے۔ ان میں سے زیادہ تعداد ان فن کاروں کی تھی جو صوفی صاحب پر فقرے کسا کرتے تھے۔ صوفی صاحب اور غلام حسن شگن (بھائی لال کے چھوٹے صاحبزادے) نے اکوائی تال میں پوریا گایا۔ جس کے بول ہیں۔

بولیاں دے نال سانوں چھڈ نیں گیا

اس تال میں پوریا سن کر معترضین انگشت بدنداں رہ گئے صوفی نے چوٹ کھائے ہوئے دل سے گایا۔ اپنے مغفور بھائی خلیفہ نتھ مرحوم کی روح کو خراج عقیدت ادا کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ صوفی صاحب نے بھرے پنڈال میں چیلنج کیا کہ کسی کو ناز ہو تو میرے سامنے بیٹھ کر گائے۔ کسی کا سر پھرا تھا کہ یہ چیلنج قبول کرتا!

اس کے بعد صوفی صاحب امرتسر سے باہر نکلے ہندوستان کے مختلف شہروں میں کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے فن سے گانے والوں کو متعارف کرایا۔۔۔

۱۹۴۰ء میں کلکتے میں ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی۔ صوفی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا۔ اتنا اچھا گائے کہ انہیں بھی میڈل سے نوازا گیا۔ ناہن سٹیٹ بھی تشریف لے گئے۔ وہاں رینکا دیوی کا میلہ ہوتا تھا جس میں گانے بجانے اور رقص و سرود کی محفل جما کرتی تھی۔ پی سی پنڈاری مہاراجہ کا سیکرٹری ان کی شہرت سے واقف تھا۔ اس نے راجہ سے کہہ کر انہیں بھی میلہ میں شرکت کی دعوت دی۔ مہاراجہ کسی وجہ سے میلہ میں شریک نہ ہو سکے تو چند روز بعد

دربار میں ایک خاص بزم نشاط میں صوفی صاحب کا گانا سننے کی فرمائش کی۔ انہوں نے دربار کی رعایت سے درباری شروع کی۔ یہ راگ نہیں راگنی ہے اور بڑی پرسکون راگنی۔ اسی لیے شہنشاہ اکبر اس سے نیند کا کام لیتے تھے۔ اگر اسے صحیح طور پر گایا جائے تو یقیناً نیند آ جاتی ہے۔ درباری اور اڑانا میں کافی مماثلت ہے۔ فرق یہ ہے کہ درباری کو نیچے نیچے ہی کھولا جاتا ہے۔ اوپر کھلنے سے اڑانے کی شکل بن جاتی ہے۔

درباری کا گانا تھا کہ حاضرین پر غنودگی طاری ہوگئی صوفی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ استاد کی نظر اور خدا کا فضل تھا جس نے بھری بزم میں سُرخ رو کیا۔ مہاراجہ انہیں سن کر بڑے خوش ہوئے اور اپنے درباری گویے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم بھی تو درباری گاتے تھے لیکن صوفی صاحب کی درباری میں کیا چیز تھی جس نے ہمیں سلا دیا؟ اس کا جواب اس کے پاس کیا ہو سکتا تھا۔ تاثیر ہر کہ ومہ کو تو نہیں ملتی۔ مہاراجہ نے شاگردی اختیار کی اور ان کو اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ تقسیم ملک تک مہاراجہ ناہن کے دربار سے ہی منسلک رہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہاں کا سکھ چین چھوڑا اور اپنے وطن عزیز واپس آ گئے۔ چند روز لاہور میں رہے۔ پلے روپیہ ہی کتنا تھا جو کافی دیر تک چلتا۔ آخر وہ دور آ گیا جو ہر فن کار پر کبھی نہ کبھی ضرور آتا ہے۔ اس کے بعد کراچی چلے آئے اور ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ دس برس میں جتنے پروگرام صوفی صاحب نے کیے ہیں شاید ہی ریڈیو کے کسی آرٹسٹ نے کیے ہوں۔ پھر وہاں سے بھی چھوڑا اور اب کراچی میں موسیقی کا درس دیتے ہیں۔ صوفی صاحب نے موسیقاروں کی ایک سوسائٹی بنا رکھی ہے جس میں بیس پچیس گانے والے شامل ہیں۔ یہ اس کے کارکن اعلیٰ ہیں اور اس سوسائٹی کے زیر اہتمام فن کاروں کے وفد لے کر اندرون ملک و بیرون ملک جاتے ہیں۔ صوفی صاحب کی خواہش ہے کہ فن کار دب کے نہ رہے۔ اُسے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا ہونی چاہیں۔ اُن کی بے لوث خدمات سے خاندانی گویے بھی

ان کی عزت کرتے ہیں۔ پچھلے سال نزاکت علی سلامت علی کی معیت میں صوفی صاحب نے ہندوستان کا دورہ کیا اور وہاں کامل چھ ماہ رہ کر پاکستانی فن کاروں سے ہندوستان کو متعارف کرایا۔

انہیں صرف دو چیزوں سے محبت ہے۔ اول اپنے آرٹ سے جس کی خاطر انہوں نے خاندان تک کی پرواہ نہ کی۔ دوسری محبوب ان کی رفیقۂ حیات ہیں جنہوں نے عسرت میں صوفی کو دلاسا دیا۔ خود بھوک برداشت کی لیکن اپنے فن کار شوہر کے حوصلے بڑھائے۔

ناہید نیازی

فن کا ستارہ۔۔۔۔۔آواز کا شعلہ

سجاد سرور نیازی کا اسم گرامی قلم اور موسیقی کے میدان میں کافی معروف رہا ہے۔ابھی یہ طالب علم ہی تھے کہ موسیقی کے تمام شعبوں پر دسترس حاصل کر لی۔حتیٰ کہ سب ساز بھی بجانے کے سیکھ لیئے۔ طبلے جیسا مشکل ساز بھی نہ چھوڑا۔آواز میں بھی مٹھاس اور گھلاوٹ تھی۔غزل، ٹھمری وغیرہ خوب گاتے تھے۔ریڈیو سے مدتوں ''ایک صاحب'' کے نام سے پروگرام کرتے رہے۔ مشہور ہے کہ لوگ ان کی آواز سننے کے لیے بڑے اشتیاق سے پروگرام شروع ہونے پہلے ہی ریڈیو سیٹ کھول کر بیٹھ جاتے۔ابھی یہ بی،اے کے طالب علم تھے کہ ان کو ایک فلم میں ہیرو کا چانس ملا۔مگر فلم بیماری کی وجہ سے اختتام تک نہ پہنچ سکی۔اس کے بعد کسی انگریز افسر کے سیکرٹری ہو گئے وہاں سے اُن کو ریڈیو میں لے لیا گیا جن دنوں وہ ریڈیو میں ملازم ہوئے، ریڈیو کے بالکل ابتدائی ایام تھے، ظاہر ہے کہ اُنہیں کو اس کی ترویج کے لیے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ریڈیو سے اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔عرصہ تک H.M.V میں بھی میوزک ڈائرکٹر رہے۔اپنے زمانے کا مشہور ترین گانا

اک بار پھر کہو ذرا۔۔۔۔۔

اُن ہی کا لکھا ہوا ہے اور اس کی دُھن اور موسیقی بھی اُنہوں نے ہی ترتیب دی تھی۔

لندن کے قیام کے دوران میں بی بی سی والوں نے بھی اُن سے معاہدہ کرنا چاہا، لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے وہ واپس ہندوستان چلے آئے۔ انہیں ایام میں امریکہ کی کسی فلم میں ایک ساز بجنے کی ترتیب کے لیے اُن کی خدمات طلب کی گئیں۔ لیکن یہ معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔۔۔۔ یہ ہیں سجاد سرور نیازی۔۔ جو علامہ اقبالؒ، حافظ محمود شیرانی (اختر شیرانی کے والد) اور حکیم اجمل خاں کے نیاز مندانِ خصوصی میں سے ہیں۔ علامہ اقبالؒ مرحوم نے تو ان کے متعلق ایک تعریفی نوٹ بھی لکھا تھا۔ جو حال ہی میں ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے فلم فیسٹیول نمبر میں چھپا ہے۔

ناہید نیازی، انہیں سجاد سرور نیازی صاحب کی صاحب زادی ہیں۔

یہ میانوالی کے پٹھان قبیلے نیازی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ۲۶ فروری ۱۹۴۱ء لاہور میں ان کی ولادت ہوئی۔ ان کی والدہ کہتی ہیں۔ ابھی یہ چھ سات برس ہی کی تھیں کہ بڑے انہماک سے ریڈیو کے ساتھ کان لگا کر بیٹھی رہتی تھیں۔ باپ کا فن ورثے میں ان کو مل چکا تھا۔ چنانچہ ان کا ذوق شوق دیکھ کر نیازی صاحب نے ان کی تربیت شروع کر دی اور موسیقی کی خود ہی تعلیم دینے لگے۔ کلاسیکی موسیقی کی زیادہ تعلیم نہیں حاصل کی۔ چند راگوں اور تانوں وغیرہ کی تعلیم ضرور ہوئی۔ نیازی صاحب نے زیادہ توجہ تہذیبِ آواز پر صرف کی، جو اس وقت کی چند مغنیات کو نصیب ہے۔ آہنگ و صوت میں آوارگی فن کی تذلیل ہے اور اس کے ساتھ خود فنکار بھی ذلیل ہوتا ہے۔ سجاد صاحب نے برسوں کے مطالعہ کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ سُر کی صحیح پہچان بہت کم لوگوں کو ہے۔ Vulgarity زیادہ ہے اور سچائی کم۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بیٹی کی تعلیم اس طریق سے شروع کی وہ اپنی ہمعصر گانے والیوں سے بالکل الگ نظر آتی ہیں۔ ان کی آواز میں وہ نستعلیق انداز ہے جو ان کے والد نے سالہا سال کی محنت اور ریاضت کے بعد حاصل کیا۔

۱- جھلملانے لگا زندگی کا دیا۔۔۔۔۔

۲- سیاں جی کو ڈھونڈنے۔۔۔۔(فلم ناگن)

۳- چلی رے چلی رے میں تو دیس پیا کے چلی رہے۔۔۔۔(فلم جھومر)

۴- کیوں جگاتے ہو میرے سینے میں ارمانوں کو۔۔۔۔۔۔(فلم کلرک)

۵- رم جھم رم جھم پڑے پھوار۔۔۔۔(فلم کوئل کا یہ گانا ناہید نیازی اور ان کی چھوٹی بہن نجمہ کی آواز میں)

۶- کاہے جادو کیا۔۔۔۔۔۔(فلم ہمسفر)

۷- دل نال سجن دے لائی رکھساں۔۔۔۔(فلم آبرو کی مُلتانی کافی)

۸- دلہنیا! روتی مت جانا۔۔۔۔۔۔(فلم جھومر)

ناہید نیازی کو فلمی موسیقی میں متعارف کرانے والے خورشید انور ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنی فلم ''ایاز'' میں ان کی آواز لی۔ یہ ۵۷ء کی بات ہے۔ یہ اس قدر ذہین فنکارہ ہیں کہ میوزک ڈائرکٹر کو زیادہ تکلیف نہیں دیتی ہیں۔ ایک آدھ ریہرسل ہوئی اور ریکارڈنگ کے لیے تیار۔۔۔۔ موہے پیا ملن کو جانے دے'' کی خورشید انور نے صرف ایک ریہرسل کرائی اور گانا ٹیک کر لیا گیا۔ اس کے باوجود اس گانے کی مقبولیت میں کوئی کلام نہیں۔

پنجابی گانے بھی ناہید نیازی نے گائے ہیں۔ ''منگتی'' کے پانچ گانے بھی ان کی آواز میں ہیں اس کے علاوہ سندھی میں بھی آٹھ گانے گائے ہیں۔ چنانچہ ''نئی کرن'' میں کئی سندھی نغمے بڑے اچھے پیرائے میں اُنہوں نے گائے ہیں۔ انگریزی گانے بھی بڑی خوبی سے گاتی ہیں۔ ایک امریکن نے ان کے انگریزی گیت سن کر مشورہ دیا تھا کہ آپ ہالی وڈ آئیں، وہاں موقعہ دیا جائے گا۔

حساس اس قدر ہیں کہ فلم ''آدمی'' کا گانا جاگ تقدیر کو جگا لونگی'' گاتے وقت رونے

گئی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گاتے وقت میں گانے میں بے حد منہمک ہوتی ہوں۔ اس کے تاثر میں ڈوب جاتی ہوں اور بعض اوقات گانے کا اس قدر اثر قبول کرتی ہوں کہ شدت احساس سے گاتے وقت رونے لگتی ہوں۔

جب ناہید سے پوچھا گیا کہ آپ گاتے وقت کن باتوں کو ملحوظ رکھتی ہیں؟ تو وہ کہنے لگیں ''سب سے پہلے بول پر میری نظر ہوتی ہے۔ اس کے بعد نغمگی اور تاثر پر۔ اپنا گانا ریڈیو یا کسی اور موقعہ پر سنتے ہوئے ان کے تاثرات جب پوچھے گئے تو وہ مزید کہنے لگیں'' میں جب اپنا گانا ریڈیو پر سنتی ہوں تو اپنی غلطیاں دور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ CRITICALLY اُس کو سنتی ہوں اور اگلے گانے میں اس کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ گویا اپنی نقاد خود بن جاتی ہوں اور اپنے ہر نغمے کو اسی ناقدانہ نظر سے دیکھتی ہوں تا کہ میرے فن میں فنی سقم دور ہو جائیں اور میرا گیت ہر اس آلائش سے پاک ہو جائے جس سے کہ فن بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ میں ابھی تک ایک سچے طالب علم کی طرح اکتساب فن کر رہی ہوں جو ہر اچھی چیز کو اپنا لیتا ہے۔ جذب کر لیتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ لگن مجھے ہمیشہ رہے تا کہ میں فن کی انتہائی بلندیوں کو چھو سکوں اور میرا سر علم کے بوجھ سے جھکا رہے۔ میں زندگی کے کسی مرحلے پر بھی نہ سمجھوں گی مجھے کچھ آتا ہے۔ تجسس اور تلاش ہی میری زندگی کا نصب العین ہے''۔

پسندیدہ فنکاروں کے متعلق جب استفسار کیا گیا تو کہنے لگیں'' پہلے پہل نور جہان کو پسند کرتی تھی لیکن اب لتا، گیتا، محمد رفیع اور مکیش میرے پسندیدہ گانے والے ہیں۔ لتا کی آواز میں جو حلاوت، شیرینی، جذبے کا عمق اور فن کی گہرائی ہے وہ کسی میں نہیں پائی جاتی۔ لتا کی آواز میں تلوار کی سی کاٹ اور شعلے جیسی گرمی اور پاکیزگی ہے۔ جس سے ہزاروں لاکھوں دل تنویر اور ضیاء حاصل کرتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی میں بڑے غلام علی خاں اور

نزاکت علی خان، سلامت علی خاں مجھے پسند ہیں۔ یہ اس لیے مجھے پسند ہیں کہ فنی باریکیوں کے باوجود ان کے سنگیت میں وہ چاشنی اور گھلاہٹ ہے جو دلوں کو تسخیر اور ذہنوں کو روشن کرتی ہے۔ یہ فنکار ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

جس کی روشنی میں ہم اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ ورنہ اس گھپ اندھیرے میں کون تھا جو قندیل کا کام دیتا اور کروڑوں نفوس کو شانتی عطا کرتا"

موسیقی کی موجودہ حالت اور ترویج کے متعلق جب اُن کی رائے طلب کی گئی تو انہوں نے کہا" ہمارے ہاں موسیقی کو علم کی حیثیت نہیں دی جاتی۔ کوئی علم اس وقت تک نہیں پھلتا جب تک کہ اس کی باقاعدہ اسٹڈی نہ کی جائے اور اس کی THEORY کا مطالعہ نہ کیا جائے، اس کی ترویج و ترقی جبھی ممکن ہوگی کہ اس کو SUBJECT کا درجہ دیا جائے، اسکولوں، کالجوں میں اس کی کلاسیں ہوں اور اس کو زیادہ زیادہ کلچرڈ بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس پر کتابیں لکھی جائیں اور موسیقی کی لائبریری کی تشکیل کی جائے۔ صحیح، باکمال اور پڑھے لکھے لوگوں کا فقدان بھی موسیقی کی ترقی میں حائل ہے دوسرا نقص جو سدراہ ہے وہ یہ ہے کہ فنکار کو یہاں پیٹ بھر کر کھانا بھی بمشکل نصیب ہوتا ہے تو اس کا فن کیا خاک ترقی پذیر ہوگا!!!

یہ فن جبھی اوج کمال پر پہنچے گا کہ یہاں کے فنکاروں کو پورا معاوضہ ملے، دوسرے پیشوں کی طرح ان کو بھی عزت و تکریم سے TREAT کیا جائے اور ان کے لباس، رہائش اور خوراک کا معقول انتظام ہو، جب جا کر موسیقی کو ترقی نصیب ہوگی۔

رفیق غزنوی

جینا کافی مشکل ہوگا
لوگوں کو مر جاتے دیکھا

لیجئے ایک اور سانحہ آ گئی۔ گزشتہ ہفتے جناب رفیق غزنوی کا بعارضہ قلب انتقال ہوگیا۔

کُلُّ مَن علَیہا فان وّیبقیٰ وجہُ ربکّ ذُوالجلالِ والاکرام

یقین نہیں آتا کہ ایسا ہنسوڑ، زندہ دل اور باغ و بہار انسان یوں زندگی کو تیاگ دے گا جس سے اس نے بے پناہ اور بھرپور پیار کیا تھا۔ لیکن

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

آپ کے بزرگ غزنہ کے رہنے والے تھے۔ میوند کی لڑائی کے بعد وہ امیر یعقوب خاں اور ایوب خاں کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے۔ اس لئے انہیں فراری کہتے ہیں۔ آپ کے دادا کا نام کیپٹن مظہر خاں اور والد کا نام محمد شریف غزنوی تھا جو قالین اور فرنیچر کا کاروبار کرتے تھے۔ آپ کی پیدائش یکم مارچ ۱۹۰۸ء کو راولپنڈی میں ہوئی۔ میٹرک تک پنڈی میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ انٹر کے بعد گورنمنٹ کالج میں آ گئے۔ یہاں بیمار ہونے کے باعث امتحان نہ دے سکے اور بعد میں

گائیکی میں اروڑے خان صاحب۔ باقی کوئی ایسا دروازہ نہیں بچا جس کو نہ کھٹکھٹایا ہو اور علم و فن کی بھیک نہ مانگی ہو۔"

اس موقعہ پر ایک لطیفہ سنایا کہ گودڑ خاں صاحب مجھے پوریا کی ایک چیز نہیں سکھاتے تھے۔ ان کے محلے کا ایک تھانیدار میرا دوست تھا۔ اس سے میں نے ساز بازکی اور گودڑ خان ایک مقدمے میں ماخوذ کو توالی لائے گئے اور چھٹکارا جب جا کر ہوا کہ وہ بندش وہیں تھانے میں ان سے سیکھ لی۔"

اُن کے پسندیدہ راگ للت، بھیروں بھار، اھیر بھیروں، میاں کی ٹوڑی، شدھ سارنگ، ملتانی، مدھونتی، ایمن، گورکھ کلیاں ابھوگی کانہڑا، کلاوتی، چندر کونس اور پوریا تھے۔

مشکل راگوں کے بارے میں پوچھا تو فرمایا "مشکل راگ ہر وہ راگ ہے جو بخوبی نہ گایا جا سکے اور جو مشکل راگ ہوگا ظاہر ہے وہ سرے سے راگ ہی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں لطافت اور حسن مفقود ہوگا۔ اور نہ ہی روانی ہوگی۔ اُن کے پسندیدہ گائیکوں کے متعلق بات کی تو انہوں نے ہنس کر کہا "رفیق غزنوی' اس کے بعد کوئی اور....." پھر کہنے لگے ہر وہ گویا جو اچھا گاتا ہے، مجھے پسند ہے۔ موڈ کی بات ہے۔ بعض اوقات اچھے سے اچھا گویا بھی بہت برا گاتا ہے۔ بڑے غلام علی خاں مرحوم، امیر خاں (افسوس ہے ان کا حال ہی میں کار کے حادثے میں انتقال ہوگیا)، امانت علی فتح علی اور اُمید علی خاں میرے پسندیدہ گویے ہیں۔"

"سازندوں میں سے مجھے ستار نواز ولائت خاں، سارنگی نواز ظہوری خاں مرحوم استاد نتھو خاں، سرود نواز علی اکبر خاں، آنجہانی پنا لال گھوش نے نواز، عبدالعزیز خاں (وچتر وینا) اور بسم اللہ خاں شہنائی نواز بہت پسند ہیں۔"

علامہ اقبال مرحوم کی زندگی میں صرف رفیق صاحب کو اجازت تھی کہ وہ ان کی غزلیں گا سکیں۔ انہوں نے بڑی خوبصورت اور نادر بندشوں میں غزلوں کو باندھ کر گایا جو رفیق رنگ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس کے علاوہ HMV کیلئے ایک سازینہ ''ہندوستان'' کے نام سے ترتیب دیا جسے مشہور فلم ڈائریکٹر الیگزنڈر کوڈا نے مشہورِ زمانہ فلم Thief of Baghdad میں استعمال کیا۔ متعدد سازینے BBC سے نمائندہ سازینوں کے طور پر نشر ہوتے رہے۔

ایک بھولی بسری، سر میں ڈوبی ہوئی آواز کی ملکہ، تان سین کی ثانی (جو خورشید بانو کے عرفِ عام سے مشہور ہیں) نے بھی ایک ملاقات پر کہا تھا کہ رفیق غزنوی جیسا باکمال موسیقار کم ہی سننے میں آیا ہے۔ اُن کے محبوب شاعر میر تقی میر۔ معنی، بندش اور اسلوب کے لحاظ سے غالب اور اسلوب کی ندرت، عجمیت، اور بے باک عظمت کے اعتبار سے فیض تھے۔ ادیبوں میں منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور پطرس بخاری بہت پسند تھے..... منٹو نے برہنائے یارانہ ایک بڑا بیباک سا مضمون ان پر لکھا تھا۔ جب اس کا تذکرہ کیا تو کہنے لگے ''ہاں وہ بڑا شریر اور عزیز دوست تھا۔ اُسے میں نے ایک خط بھی لکھا تھا جو پوسٹ نہ ہو سکا۔ اور اس کا انتقال ہو گیا۔ جس میں میں نے اُسے لکھا:

''آج کل تمہاری کتابیں نہیں بکتیں تو تم نے یاروں کو بیچنا شروع کر دیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اداس ہو گئے۔

رفیق غزنوی نے اپنے پیچھے بہت سے معنوی شاگرد چھوڑے ہیں مثلاً مدن موہن، لال محمد اقبال اور مہدی ظہیر وغیرہ۔ آنجہانی روشن نے بھی آپ سے کسبِ فیض کیا تھا۔

مرحوم نے وچتر وینا بجانے میں بھی جدت اور اختراع سے کام لیا تھا۔ گوٹ یا بلوری بٹھ کی بجائے وہ بڑی سی سیپ کو تاروں پر بڑی پھرتی سے چلاتے اور سر کے اتار چڑھاؤ کے

مطابق اپنے چہرے پر کیفیت پیدا کرتے۔ گویا سران پر نازل ہوتے تھے۔

افسوس صد افسوس! سروں کا نبض شناس، وینا کا نباض، اور ہزاروں نغموں کا خالق ہم میں موجود نہیں ہے۔ ان کی وچتر وینا آج خاموش ہے گویا

خامشی چھیڑ رہی ہے کوئی نوحہ اپنا
ٹوٹتا جاتا ہے آواز سے رشتہ اپنا
اپنی کھوئی ہوئی آواز رسائی مانگے
جاں سے الجھا ہے کوئی نغمہ رسیلا اپنا

ماسٹر جھنڈے خان

انیسویں صدی کے آخری سال تھے یا بیسویں صدی کی ابتدا تھی کہ ایک موسیقار اعظم نے جموں شہر میں جنم لیا۔ پتہ نہیں جموں شہر کی مٹی میں ہی موسیقیت رچی ہے کہ اس نے تین صاحب طرز اور باکمال موسیقاروں کو پیدا کیا جو اپنے فن میں منفرد اور یکتا ہیں، اور ان کی نظیر مشکل سے ہی ملتی ہے۔ میری مراد خان صاحب جھنڈے خان صاحب مرحوم، کندن لال سہگل آنجہانی اور ملکہ پکھراج سے ہے۔ جھنڈے خان صاحب جہاں علم موسیقی کے بحر نا پیدا کنار تھے تو سہگل آواز کا بادشاہ تھا۔ اور پکھراج غزل اور ہلکی پھلکی موسیقی کی ملکہ ہیں۔ آج ہمیں جھنڈے خان صاحب کا تعارف کرانا ہے، جنہوں نے تھیٹر کی موسیقی کو آسمان رفعت تک پہنچایا اور اس پر اپنے دائمی نقوش چھوڑے۔

مرحوم جناب فیروز نظامی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ شہر گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے، لیکن جھنڈے خان صاحب کی صاحبزادی اس روایت کی تردید کرتی ہیں، اور کہتی ہیں کہ ان کی جنم بھومی جموں کا شعر پرور اور موسیقی خیز خطہ ہے۔ ابتدائی ایام میں پنجاب ہی میں رہ کر موسیقی اور ہارمونیم کی تعلیم حاصل کی، لیکن اس علم سے ان کی تشفی نہ ہو سکی، اور علم کی چاٹ انہیں بمبئی لے گئی، جہاں بڑے بڑے نامی گرامی استادانِ موسیقی موجود تھے، مرشد کی تلاش تھی، سینے میں سچے علم کی قندیل جل رہی تھی۔ ایک چھوڑ تین مل گئے۔ بمبئی پہنچ کر چھجو خان، نذیر خان، خادم حسین خان بھنڈی بازار والوں کے شاگرد ہو

گئے، جو راگداری کے فن میں اپنے عہد کے امام تھے، فیروز نظامی اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ایک دفعہ دوران گفتگو جب میں نے پوچھا کہ چھجو خان، نذیر خان، خادم حسین صاحبان کے گانے کا انداز کیا تھا، تو وہ بے اختیار رونے لگے۔آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے، بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔۔۔بیٹا ان لوگوں کے گانے کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے، آج ان لوگوں کا گانا ایک سہانا خواب معلوم ہوتا ہے۔بس یہ سمجھ لو کہ میرے استاد علم کا ایک سمندر تھے اور میں ان کے مقابلے میں صرف ایک حقیر قطرہ ہوں۔۔۔"

ایسے یگانہ روزگار استادوں سے جھنڈے خان صاحب نے گائکی کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم حاصل کی، جس نے ان کی کایا ہی پلٹ دی، ذہن رسا ملا، جو استاد نے بتایا جذب کر گئے، اور عمر بھر ان کے احسان مند رہے۔بات بات پر جذبہ تشکر سے ان کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔یہ تھا آج سے نصف صدی پہلے استاد اور شاگرد کا تعلق۔۔۔

ایسے بزرگوں کی نظروں نے انہیں علم موسیقی کا صحیح شیدائی بنا دیا۔وہ ایک مخلص طالب علم کی طرح تمام عمر اکتساب علم کرتے رہے۔جہاں سے کوئی اچھی چیز ملی، حاصل کر لی۔ غرور، بخل اور کبر نفس کے مریض نہ تھے۔بزرگوں کا احترام اور بچوں اور کم عمروں پر شفقت ان کا مسلک رہا۔استاد برکت علی خان ان کے متعلق ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔۔۔۔

لاہور کے کسی سٹوڈیو میں برکت علی خان کا کوئی گانا ریکارڈ ہونا تھا۔ٹھیکا لگانے والا ان سے کدر کھتا تھا۔بے تال کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن استاد برکت علی خان بھی کچی گولیاں نہیں کھیلتے تھے۔تال کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔استاد جھنڈے خان بھی موجود تھے۔گائک اور طبلئے کی نوک جھونک دیکھی مسکرا کر برکت علی خان کو مخاطب کیا اور کہا "بھلیا ہویا وی سوہنا پیا لگنا ایں"۔

اس قسم کی حوصلہ افزائی اور شفقت آج کی دنیا میں مشکل سے نظر آتی ہے۔علم ان کو

توازن بخشتا تھا۔ تننا نہیں جھکنا سکھاتا تھا۔ اس لیے ان کا فن پائیدار، دائمی اور اعلیٰ ہے۔

جھنڈے خان صاحب موسیقی کے نابغہ Genius تھے۔ فیروز نظامی صاحب انہیں گنی، گندھرپ اور نائیک تینوں خطاب دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک گنی وہ ہوتا ہے جو مروجہ راگوں سے بخوبی واقف ہو اور ان کو گا بجا سکتا ہو۔ گندھرپ وہ ہوتا ہے جو زمانہ ماضی کے راگوں اور مروجہ راگوں کو بخوبی گا بجا سکتا ہو اور نائک اس شخص کو کہتے ہیں جو زمانہ ماضی و حال کی موسیقی کا عالم باعمل، علم موسیقی کا واقف کار اور راگوں کے بنانے کا قاعدہ جانتا ہو۔

جھنڈے خان صاحب سے پہلے ہلکی پھلکی موسیقی میں لفظوں کو مطلقاً کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ لفظوں کو مسخ کر کے کسی گیت کی دھن بنائی جاتی تھی۔ مشکل اور ادق تانوں، الاپ، مرکیوں، زمزموں اور مینڈھ کو ہی موسیقی کا جزو اعظم سمجھا جاتا تھا۔ لفظوں کی صحت کو ان شعبدہ بازیوں پر قربان کر دیا جاتا تھا۔ موسیقی کے ان اجزا کو موقع بموقع ضرور استعمال کرنا چاہئے، تاکہ گیت میں تنوع اور ندرت پیدا ہو۔ مرکیوں اور زمزموں سے بیل بوٹوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ خوبصورت تانوں سے بھی دھن کی تزئین اور آرائش ہو سکتی ہے۔ مینڈھ کا استعمال بھی کثرت سے ہونا چاہئے تاکہ دھن فنی اور جمالیاتی دونوں لحاظ سے موسیقی کا حسین مرقع ہو۔۔ لیکن سب سے مقدم چیز لفظ ہیں۔ جن سے کہ گیت کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ سامعین جس سے موسیقی کے شہ پارے کا پورا پورا لطف اور تاثر لیتے ہیں۔ اگر صرف فنی لوازم کا خیال رکھا جاتا ہے اُلٹا الفاظ کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی تو ایسی موسیقی کا اثر نصف رہ جائے گا۔۔۔ اسی لیے ہماری کلاسیکی موسیقی کو زیادہ تحسین کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، کیونکہ اس میں لفظوں کی کھال اتار کے رکھ دی جاتی ہے اور حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے۔

جھنڈے خان صاحب جب تھیٹر میں پہنچے تو الفاظ کے اس پوسٹ مارٹم کو دیکھ کر انہیں سخت دھچکا لگا۔ چنانچہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ توجہ الفاظ پر صرف کی۔ اور دھن بناتے

وقت الفاظ کے ایسے ٹکڑے کرنے سے احتراز کیا جن سے کہ اس کا مجموعی تاثر مجروح ہو۔ انہوں نے الفاظ کی روح کو پہلے پہچانا اور موسیقی کو ثانوی حیثیت دی۔ وہ گیت کی تہہ تک پہنچتے تھے اور پھر اس کے مطابق ایسی دھن تیار کرتے تھے جو اس گیت کے بوجھ کو برداشت کر سکے۔ اُلٹا گیت پر لادو نہ ہو جائے۔ استاد مرحوم ایسے صاحب نظر اور موسیقی کے ودوان تھے کہ انہوں نے سروں اور سرتیوں کی بجائے الفاظ سے ہی کام لینا شروع کر دیا۔ مثلاً سازندے کو کوئی خاص جگہ یا مقام بتانا ہے تو الفاظ کے سہارے اس طرح وہ مقام بتاتے تھے کہ سازندہ فوراً اس جگہ کی گرفت کر لیتا تھا۔ دھن بناتے وقت بھی وہ سروں کی بجائے الفاظ کو زیر لب دہراتے تھے، اور ان کا مقام متعین کر کے دھن کو آخری شکل دیتے تھے۔ موسیقی سے تعلق رکھنے والے حضرات اس طریقے کے اشکال کو بخوبی سمجھتے ہیں، اور یہ پیچیدہ انداز ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لیے محنت کے ساتھ ساتھ اہل بصیرت ہونا بھی لازمی ہے۔

ظاہر ہے کہ تھیٹر دیکھنے والوں کی پسند اور ناپسند نے طرز موسیقی بدلنے کا خیال انہیں سمجھایا۔ انہوں نے ناٹک دیکھنے والوں کے شوق کا بغور مطالعہ کیا اور خداداد بصیرت اور شعور موسیقی سے ایک ایسے انداز کی بنیاد رکھی جو سب سے نرالا، انوکھا، اچھوتا اور پسندیدہ ہے۔ ان کی دقت نظر نے ناظرین کی آنکھوں سے بھانپ لیا کہ وہ کس قسم کا میوزک چاہتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ عوام کے ذوق کی خاطر وہ اپنے معیار سے نیچے اترے، اور سوقیانہ اور چلت قسم کی بازاری دھنیں بنائیں۔ انہوں نے جو دھن بھی بنائی، وہ کسی نہ کسی راگ کی آسان تر صورت ہوتی تھی۔ اور اپنی تمام تر فنی استعداد کو اس کی تہذیب اور تزئین کے لیے استعمال کیا۔ موسیقی میں یہ اجتہاد آج تک پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور آج کا فلمی میوزک بھی خان صاحب کا خوشہ چین ہے۔ انہی خطوط پر فلمی موسیقی استوار

ہوئی جوانہوں نے تھیٹر کے لیے چنے تھے۔ان کی موسیقی کے دو(۲) بنیادی عناصر صحت الفاظ اور صحت موسیقی تھے اور ہر اچھا موسیقار ان کے وضع کیے ہوئے ان اصولوں پر چل کر منزل مقصود تک پہنچا ہے۔ مشہور میوزک ڈائریکٹر نوشاد علی نے بھی ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ وہ خان صاحب کے تبحر علم اور موسیقی دانی کے معترف ہیں، اور ان سے استفادہ کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔ جناب فیروز نظامی کی یہ رائے سو فیصد درست ہے۔ ''استاد جھنڈے خان ایسے صاحب کمال تھے کہ اگر موجودہ روش کی بجائے کسی اور قسم کی بنیاد رکھتے تو آج ہماری موسیقی کا انداز بھی وہی ہوتا''۔

جس طرح تھیٹر ان کے کارناموں کا احسان مند ہے۔اسی طرح فلم بھی زیر بار احسان ہے۔تھیٹر کی ملازمت کے بعد انہوں نے فلم ''چتر لیکھا'' کی موسیقی ترتیب دی۔اس میں ایسے کمالات دکھائے جن سے ان کی فنی معراج کا معترف ہونا پڑتا ہے۔سٹیج کے تجربات فلم میں بھی کام آئے اور خان صاحب نے اس فلم کے تمام گانے سدا سہاگن راگنی بھیرویں میں مرتب کیے۔بھیرویں کے سروں کو ہر ایک گانے میں ایسی اچھوتی ترکیب سے برتا کہ وہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، اور یہ صرف بندش کا ہی کمال تھا۔''چتر لیکھا'' کا ہر گانا مقبول ہوا۔استاد جھنڈے خان نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس فلم کی پس منظر کی موسیقی بھی بھیروین میں ترتیب دی۔ یہ ایسا بڑا کارنامہ ہے جو فلمی موسیقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔علم کے ساتھ ان میں خوش سلیقگی بھی تھی، جس نے انہیں فلمی موسیقی میں بھی سب سے ممتاز اور اعلیٰ وارفع مقام دیا ہے۔اپج کے احترام کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں راگداری کا احترام بھی تھا۔انہیں پتہ تھا کہ فلم کسی وقت بھی چل سکتی ہے، اور راگ کے وقت کی تعین بھی ان کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ انہوں نے بھیروین راگنی کا انتخاب کیا، جو ہر وقت گائی بجائی جا سکتی تھی۔احترام فن اور لطافت تخیل کی یہ بیّن دلیل ہے۔رام

دلاری کی آواز کا انتخاب بھی فلم ''چتر لیکھا'' کے گانوں کے لیے نہایت موزوں تھا۔ آج بھی جب ہم یہ نغمات سنتے ہیں تو وہی بانکپن، رعنائی اور شکوہ نظر آتا ہے جو خان صاحب کے ذہن میں تھا۔ اس میں مطلق غرابت نظر نہیں آتی۔ اچھی موسیقی ہر عہد کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اس میں پرایا پن نہیں پایا جاتا۔ یہ نغمات دائمی اقدار کے حامل ہیں۔ ذیل میں ان گیتوں کے مکھڑے لکھے گئے جاتے ہیں، تاکہ قارئین کرام بھی خود بھی سن کر اندازہ لگا سکیں کہ ان میں جدت ہے یا نہیں۔۔۔۔

(۱) جوبن کی بگیا مہکی
(۲) رت آئے رت جائے
(۳) نیل کمل مسکائے
(۴) تم جاؤ جاؤ
(۵) نیا دھیرے دھیرے
(۶) جاگا کرنوں والا
(۷) پریم ہی جانے
(۸) سندر ہے سنسار سادھو
(۹) سیاں سانورے

عرصہ ہوا میں جھنڈے خان صاحب کی صاحبزادی سے ان کی موسیقی دانی اور کارناموں کے متعلق مزید معلومات کا طالب ہوا تھا۔ وہ بار بار ان کی نماز اور عبادت کا تذکرہ کرتی تھیں اور موسیقی کے نام سے چڑ جاتی تھیں۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ موسیقی نماز روزے کو کچھ ضرر نہیں پہنچاتی اور نہ موسیقی اور عبادت میں کوئی مخاصمت ہے۔ انہوں نے اپنے والد مرحوم کے متعلق زیادہ عادات و خصائل کی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تقریباً انہیں کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔۔۔ ''والد مرحوم بچپن ہی سے مذہبی تعلیم کے بڑے دلدادہ تھے۔ اُن کو اسلام کے اصولوں پر چلنے کا بے حد شوق تھا۔ چودہ برس کی عمر میں وہ مرشد کی تلاش میں گھر سے نکلے اور جستجو نے انہیں حیدر آباد دکن پہنچا دیا۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے پہلا سفر تھا۔ آخر کار اُن کو بڑے کامل اور پہنچے ہوئے مرشد مل گئے، جنہوں نے اپنی

رہنمائی میں ان کی توجہ خدا کی طرف اور بھی بڑھا دی۔ رفتہ رفتہ ان کو خدا کی اتنی زیادہ لت لگ گئی کہ وہ ہر وقت خداوند تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہنے لگے۔ بچپن ہی سے نماز روزہ کے بڑے پابند تھے۔ عمر بھر کبھی نماز قضا نہیں کی۔ وہ بڑے سخی دل واقع ہوئے تھے۔ خدا کی راہ میں بڑی فراخدلی سے خرچ کرتے تھے۔ مسجدوں کی تعمیر و مرمت میں ہمیشہ حصہ لیتے تھے۔ درویشوں، پیروں اور مرشد کی بہت قدر کرتے تھے اور انہیں دل سے چاہتے تھے۔

والد مرحوم کو اپنی گھریلو زندگی سے بڑی محبت تھی۔ بچوں کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ بچوں کی خوشنودی خواہشات کا پورا پورا خیال و احساس رکھتے تھے، اور ان کے لیے ہر طرح کا آرام و آسائش مہیا کر رکھا تھا۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دلوائی۔ مذہبی تعلیم سے بھی بیگانہ نہ رکھا۔ نماز روزے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اُن کو شروع سے ہی کھیل تماشے کا شوق نہ تھا۔ عبادت، والدین اور بال بچوں کی پرورش کرنا اولین فرض سمجھتے تھے۔

کاروباری سلسلے میں وہ حیدرآباد دکن سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں انہیں ڈرامہ نویس پنڈت نرائن پرشاد بیتاب ملے جو اپنے فن میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے اظہار خیالات کیا۔ جلد ہی گہرے تعلقات استوار ہو گئے۔ بیتاب صاحب ان کی ذہانت، شخصیت اور خداداد قابلیت کے بہت بڑے قدردان بن گئے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہمیشہ دونوں اکٹھے مل کر یہ کام کریں گے۔ بیتاب صاحب ڈرامے لکھتے اور وہ موسیقی ترتیب دیتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات سیٹھ کاؤس جی کھٹاؤ سے ہوئی جو پارسی نژاد تھے اور بہت بڑے سرمایہ دار اور گیانی آدمی تھے۔ انہوں نے اُستاد جھنڈے خاں کو اپنے تھیٹر نیو الفرڈ میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ پہلے وہ رضامند نہ ہوتے تھے۔ بالآخر کاؤس جی کھٹاؤ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے، اور والد مرحوم کو ڈائیریکشن اور سیٹنگ کا کام

سپرد کیا گیا۔اس کے بعد کچھ عرصہ تک ماڈرن تھیٹر میں بھی کام کیا۔جن کے نام یہ ہیں۔
رنجیت فلم کمپنی بمبئی، کمل رائے پکچرز بمبئی، بھارت فلم کمپنی۔۔۔وغیرہ وغیرہ

والد مرحوم نے اپنا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ان کا کردار اور ظرف بہت اونچا تھا۔ بڑی نامور کمپنیوں میں ملازمت کی اور بڑی عزت پائی۔ ہمیشہ کمپنی والوں کے اصرار اور مجبور کرنے پر معاہدہ کرتے تھے۔ دراصل انہیں اس کام سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ چونکہ وہ خداداد قابلیت رکھتے تھے،اس لیے مجبور کرنے پر رضامند ہو جاتے تھے۔ان کی اپنی توجہ اور دلچسپی دھیان گیان میں تھی۔

دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کبھی ان کی نماز اور عبادت میں خلل انداز نہ ہو سکی۔فوٹو تک زندگی بھر نہیں اتروایا۔ جب کبھی فوٹو کھینچنے کا کسی نے ارادہ کیا، کیمرا خراب ہو جاتا رہا۔ انہیں تصویروں سے نفرت تھی،اور تصویر اتروانے کے سخت خلاف تھے"۔

جھنڈے خان صاحب زندگی کے آخری ایام میں گوجرانوالہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ان دنوں ان کا واحد مشغلہ عبادت تھا۔گوجرانوالہ کے بہت سے حضرات نے انہیں گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر آتے جاتے دیکھا ہے۔ آخر سنگیت کا یہ عظیم استاد سروں کا مزاج شناس، راگوں کا نباض، فلمی موسیقی کا بانی، شفیق باپ، خدا ترس اور متقی شخص ۱۱۔اکتوبر ۱۹۵۲ کو اپنے پیدا کرنے والے کے پاس جا پہنچا۔ گوجرانوالہ کی خاک میں اس کی تدفین ہوئی۔ موسیقی آج بھی اس کے لیے سوگوار ہے،اور سُر اس کی یاد میں نوحہ کناں ہیں

ع مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

پنڈت روی شنکر (ستارنواز)

"نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

پنڈت روی شنکر نے یورپ اور امریکہ میں موسیقی کے متوالوں کے دلوں میں خاصا گھر کر رکھا ہے، کیونکہ انہوں نے ایشیائی سنگیت کو ایک خاص سمت اور طرز دی ہے۔ وہ صوت و آواز سے ایسے ایسے تجربات کرتے ہیں جو مغربی کانوں کو ناموس ہونے کے باوجود بھلے لگتے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ انہوں نے استاد سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے اور اس کے بخشے ہوئے علم کو اپنی فطری صلاحیتوں سے نیا طریق اظہار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اور تو اور ان کے یورپین شاگرد بھی روائتی انداز سے تعظیماً اُن کے پاؤں کو چھوتے ہیں۔ مثلاً مشہور بیٹل جارج ہیریسن اور دیگر شاگردوں کو راقم الحروف نے کئی بار ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ عظیم ستارنواز اور نغمہ ساز بنارس میں ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوا۔ رقص و سرود کا خاندان میں دور دورہ تھا۔ بچپن سے ہی ایسے ماحول میں رہ کر ہونہار روی نے سر اور لے کا ابتدائی رشتہ معلوم کر لیا۔ ذرا بڑا ہوا، تو اپنے بڑے بھائی اور بین الاقوامی شہرت کے رقاص اُودے شنکر کی ڈانس پارٹی میں شامل ہو گیا جہاں اُسے یورپ اور امریکہ میں ایک ڈانسر کی حیثیت سے دورہ کرنے کا موقع ملا۔ اور یہیں وہ مغربی موسیقی کے اصولوں سے واقف ہوا۔ بعد میں رقص

کی تنکنائی کا امتزاج کچھ ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جو سینیا گھرانے کے بینکاروں کا خاصہ ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں روی شنکر جی سے زیادہ اچھا الاپ آج تک کسی سے نہیں سنا۔ لَے کاری میں بھی پنڈت جی کا جواب نہیں۔ راگ کی صحت خوانی میں بھی وہ منتہی ہیں۔

جیت راگ کے بعد، پنڈت جی نے راگ کروانی (جنوبی ہند کرناٹک کا ایک خوبصورت راگ) پیش کیا اور بڑی خوبصورتی سے اس راگ کے روپ سروپ، شکل و صورت بناؤ سنگھار کو واضح کیا۔ جنوبی ہند کے راگ کو، شمالی ہند کا لباس پہنانا روی شنکر جی ہی کا کام ہے۔ اتنا ستھرا کام، اس سلیقے اور نفاست سے پیش کرنا روی جی کی عظمت اور محنت کی دلیل ہے..... اس کے بعد مزامیری درجے کی نوبت آئی..... راگ مشر کھماج میں ٹھمری انگ میں پنڈت جی نے نرت، بھاؤ اور سر کو اپنا اسیر کر لیا۔ استاد ذاکر حسین نے طبلہ سولو میں حاضرین سے بے ساختہ داد حاصل کر لی

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

راقم الحروف کو ان سے انٹرویو کا موقع ملا۔ اجمالاً پیش کرتا ہوں۔

وطنیت: بنگالی

والد کا نام: پنڈت شیام شنکر۔

تاریخ پیدائش: ۷ اپریل ۱۹۲۰ء بمقام بنارس

تعلیم: پرائیویٹ طریقے سے حاصل کی۔ فرانسیسی زبان پر عبور حاصل ہے۔ پیرس میں بچپن کا بیشتر حصہ گزرا۔

موسیقی میں استاد: ۱۹۳۸ء میں استاد علاء الدین خان کی شاگردی اختیار کی۔

مشق و ریاض: ۱۲ سے ۱۴ گھنٹہ روزانہ ستار کی مشق اور ریاضت کی۔

وہ فنکار جن سے اثر لیا: رامیشور پاٹھک۔ بہت بڑا ستاریا تھا۔

اس سے بہت متاثر ہوں (بعض واقف کاروں کا کہنا ہے کہ اُن کے استادِ اول رامیشور پاٹھک (ستارنواز) ہی تھے۔ واللہ اعلم

پسندیدہ سازندے: استاد ولایت خان، استاد علی اکبر خان، استاد بسم اللہ خاں، استاد احمد جان تھرکوا، پنڈت کنٹھے مہاراج، استاد اللہ رکھا، پنڈت کرشن مہاراج۔

پسندیدہ گویئے: استاد بڑے غلام علی خاں صاحب، استاد امیر خاں صاحب۔

استاد فیاض خان صاحب، استاد عاشق علی خان صاحب اور استاد سلامت علی خان۔

مشکل راگ: سب راگ مشکل ہیں۔

بڑے راگ: درباری کانڑا۔ اساوری۔ بلاس خانی ٹوڑی۔

پسندیدہ راگ: کلیان ٹھاٹھ اور کافی ٹھاٹھ کے راگ پسند ہیں۔ مثلاً یمن کلیان۔ ماج کھماج۔ بیراگی۔ تلک شیام۔

موہن کونس (گاندھی جی کے مرنے پر یہ راگ ترتیب دیا)۔ نٹ بھیروں اہیر للت۔ پنجم سے غارا۔ بلاس کافی وغیرہ۔

دھرپد اور خیال میں فرق: دُھرپد صوفیانہ اور حقانی چیز ہے۔ جبکہ خیال رومانٹک اور متغزلانہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ دھرپد Devotional ہے جبکہ خیال Emotional ہے۔

دھرپد کیوں غیر مقبول ہوا: دُھرپد کے پیچھے روحانی جذبہ کارفرما تھا۔ تبدیلی تہذیب سے خیال پیدا ہوا جس کی اگلی اولاد ٹھمری ہے۔ جس میں Erotic رس زیادہ ہوتا ہے۔

ساز بجاتے وقت کے تاثرات:

آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔ دل میں میٹھا میٹھا درد شروع ہوجاتا ہے۔ پھر ایک نئی

کائنات کا ظہور ہوتا ہے۔ جس میں امن، شانتی، اور سرخوشی کا راج ہوتا ہے۔

پسندیدہ: اردو شاعر: غالب اور ساحر لدھیانوی

بنگالی شاعر: سر رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام

انگریزی شاعر: شیکسپیر اور پال وٹ مین

مشغلے: مطالعہ، موسیقی کی ترتیب و تدوین۔ اچھی فلمیں دیکھنا (بیشتر اطالوی اور فرانسیسی)

زندگی کا کوئی اہم واقعہ: ڈانسر سے موسیقار (ستار نواز) بن گیا۔

فلمیں جن کی موسیقی ترتیب دی: انو رادھا۔ گودان، ستیہ جیت رے کی فلمیں۔

انگریزی فلمیں چارلی۔ چپکوا۔ Alice in wonderland۔ ''گاندھی'' اور ''میرا''

دیگر شاہکار: Sitar Concerto جسے آندرے پریوین نے کنڈکٹ کیا۔ اور لندن سمفنی آرکسٹرا نے ریکارڈ کروایا۔ خودنوشت سوانح "My music, My life" اپنی زندگی کے بارے میں فلم "RAGA"

پسندیدہ فلمی میوزک ڈائریکٹر: مدن موہن اور آنجہانی روشن۔

موسیقی کے بارے میں انفرادی رائے:

"Music is my love

And Life"

Ravi Shankar

اُستاد نتھو خاں

سنگیت کے اُستادوں کا کہنا ہے کہ استاد نتھو خان مرحوم جیسا ماہر فن سارنگی نواز نہ پانچ سو سال پہلے ہوا تھا نہ پانچ سو سال بعد پیدا ہوگا اور اگر کوئی بجاتا ہے تو صرف خیال بجا سکتا ہے، سنگت نہیں کر سکتا اور اگر کوئی سنگت ان جیسی کر سکتا ہے تو خیال کی ادائیگی اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے نتھو خان ہمہ صفت موصوف تھے۔ صرف خیال بھی بجاتے تھے اور بجانے کا حق ادا کرتے تھے۔ سننے والے سروں کے زیر و بم کے ساتھ جھومتے رہتے تھے (خود میرے سامنے ایسا واقعہ پیش آیا، خاں صاحب ریڈیو سے خیال جوگ پیش کر رہے تھے۔ جب وہ درت میں داخل ہوئے تو ملک کی مشہور مغنیہ جو بڑے غور سے 'زخمہ در کی تیز دستی' سن رہی تھی، بے اختیار ایک نامعلوم جذبے کے ساتھ ناچنے لگیں۔ ان کی سارنگی کے تاروں سے ایسے نغمے نکل رہے تھے کہ سحر سامری کا دھوکا ہونے لگا۔ فضا میں نغمگی بھر گئی تھی اور ایک عجیب لذت انگیز کیف ماحول پر چھا گیا تھا)

نتھو خان صاحب ۱۹۲۴ء میں قصبہ جنڈیالہ گرو (امرتسر) میں پیدا ہوئے، والد کا نام مولا بخش تھا۔ سب سے پہلے اپنے تایا فیروز خان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد میں مشہور سارنگی نواز خاں صاحب احمدی خاں دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ پنڈت بھاسکر راؤ کے مشہور شاگرد بھائی لال سے گائیکی بھی درست کی۔ احمدی خاں صاحب کے چھوٹے بھائی ظہوری خاں مرحوم کو بھی استاد گردانتے تھے۔ مہر علی خاں صاحب (تلونڈی والے)

سے بھی استفادہ کیا گویا ع طبع حسرت نے اُٹھایا تھا ہر استاد سے فیض

بارہ سال کی عمر تھی جب موسیقی کی تعلیم شروع ہوئی اور باقاعدگی سے بیس سال کی عمر تک سچے طالب علم کی طرح فن حاصل کیا۔ اس طرح متواتر ۸ سال تک موسیقی کے ودوانوں سے 'سُر' کی پاکیزہ اور مقدس تعلیم پائی۔ طلب صادق تھی، اس لیے استاد بھی اچھے ملے۔ نتھو خاں صاحب نے بھی کسب علم میں محنت اور خلوص کا ساتھ نہ چھوڑا اور دن رات ایک کر کے علم حاصل کیا۔ سولہ، سترہ گھنٹہ روز کا ریاض کچھ کم نہیں ہوتا۔ موسیقی کا جو شعلہ سینے میں روشن ہو چکا تھا اس کو بجھنے نہ دیا اور اپنے خون کی حرارت سے اسے تازگی اور توانائی بخشی۔ خان صاحب دیکھنے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے، لیکن جب تاروں سے نغمہ پیدا کرتے تو ان کے اپنے جسم ناتواں میں بلا کی زندگی نفوذ کر جاتی، سیاہ رنگ کے باوجود چہرہ دمک اُٹھتا، اُنگلیوں میں مشین جیسی پھرتی آ جاتی۔ یہ صحیح علم کی لگن کا کرشمہ نہیں تو کیا تھا؟

بہت چھوٹی عمر میں ہی نتھو خاں نے سال خوردہ گائیکوں سے تعریف و توصیف حاصل کر لی تھی۔ مجھے خود ایک محفل سننے کا اتفاق ہوا جس میں خان صاحب نے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگست ۱۹۶۰ء کی بات ہے کراچی میں ایک مختصر سی نشست کا انتظام کیا گیا جس میں استاد اُمید علی خاں اور مرحوم اُستاد اللہ دتہ (طبلہ نواز) بھی شریک ہوئے تھے۔ سب سے پہلے اُستاد اللہ دتہ نے طبلے پر تین تال کی گت بجائی۔ سارنگی پر لہرا نتھو خاں نے دیا۔ طبلہ تو پری پیکر کا تھا ہی لیکن سارنگی کے لہرنے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

(استاد اللہ دتہ کو اچھا طبلہ بجانے کی وجہ سے قریبی حلقوں میں پری پیکر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) اس کے بعد استاد امید علی خاں نے درباری شروع کی۔ اکبری راگ نے جو جادو جگاتا تھا وہ تو جگایا لیکن استاد نتھو خاں نے بھی سنگت کا حق ادا کیا۔ جب وہ استاد اُمید علی خاں کی ادا کی ہوئی مشکل جگہ دہراتے تو اُمید علی خاں پلٹ کر سبحان اللہ کہتے۔ وہ اتنا اپنے

راگ سے محظوظ نہیں ہو رہے تھے جتنا کہ سارنگی کی ادائیگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ محفل تو ہمہ تن گوش تھی۔ مجال تھی کہ کوئی سانس کی آواز بھی نکالتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے

ع فضا وہ نغموں سے بھر گئی تھی کہ موج دریا ٹھہر گئی تھی

یہ تاثر جبھی پیدا ہوتا ہے کہ فنکار ڈوب کر فنی کمالات دکھائے۔ اس کی ہستی اور فن میں کوئی خط امتیاز نہ رہے۔ اس کی شخصیت کی مکمل چھاپ اس وقت فن پر نظر آئے گی۔ جب وہ استغراق سے فن میں فنا ہو جائے گا۔ اس کا اصلی رنگ جب جا کر نکھرے گا.....اور نتھو خاں نے یہ مقامِ فن مدت ہوئی حاصل کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں تھے۔ علم میں قناعت کا کیا گزر!

خاں صاحب نے سارنگی میں کوئی ترمیم نہیں کی تھی۔ البتہ بجانے میں ضرور اجتہاد سے کام لیا تھا۔

خاں صاحب نتھو خاں جس طرح سارنگی بجانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اسی طرح ہارمونیم بجانے میں بھی مہارت پیدا کی تھی۔ چنانچہ چٹکیوں میں نئی دھن بنا لیتے تھے۔ فلمی موسیقی کے لیے نئی دھن بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے موسیقی کے اسرار و رموز کے علم کے علاوہ نزاکت تخیل بھی درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ کئی ایک فلموں میں آپ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ''انصاف'' اور ''پیار نہ کرنا دان'' کا میوزک بھی آپ نے ترتیب دیا تھا۔ اس کے علاوہ فلم ''بہن بھائی''، ''دیا'' ''میں نے لاکھوں کے بول سہے'' کی موسیقی بھی آپ نے مرتب کی تھی۔ فلم بہن بھائی کا یہ گانا آج مورا انگ انگ ناچے، راگ نارائنی میں کمپوز کر کے اپنے علم اور ندرتِ خیال کا ثبوت دیا۔ جسے نذیر بیگم نے گایا تھا۔ سازندے کا فن شاعر اور مصور سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اسے آواز کے ذریعہ اپنے دل کی بات سمجھانا ہوتی ہے۔ حیوانِ ناطق کی آواز سے نہیں۔ بے جان، بے روح بے حس تاروں کی آواز سے اپنے

ناخنوں کے لمس اور ہاتھ کی جنبش سے اُسے نغمہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔اس کی روح کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے نالے کی بازگشت ہوتا ہے۔اس کے آنسو بھی شامل ہوتے ہیں اور قہقہے بھی۔اس میں اس کے خون کی حرارت بھی موجود ہوتی ہے اور اس کے دل کی کیف بخش برودت بھی۔یہی وہ آگ تھی جس سے استاد نتھو خاں کا دل کندن بن چکا تھا۔دوستی زندگی کی اعلیٰ اقدار میں سے ایک اعلیٰ قدر ہے۔یہ ایک ایسی فرحت بخش چھاؤں ہے جس کے تلے زندگی کے مسافر تھکن دور کرنے اور غم اور دکھ درد بھولنے کے لیے دم بھر کو آ بیٹھتے ہیں۔یہ ہی ایک ایسی پناہ گاہ ہے جہاں انسان دنیا کے تمام بکھیڑوں سے نجات پا سکتا ہے۔اپنے تفکرات کو کم کر سکتا اور دل کا غبار نکال سکتا ہے۔نتھو خاں صاحب کے نزدیک بھی دوستی فطرت کا عظیم عطیہ تھی۔وہ اپنے ہم عصر فنکاروں سے ہرگز پرخاش نہیں رکھتے تھے۔فن کی تعظیم کرتے تھے اور اعلیٰ فنکاروں کی عزت کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔افسوس ہم سے ایک منفرد موسیقار، باکمال فنکار اور عزیز دوست چھن گیا۔

حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں
مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے

چوٹ اس سازنے مضراب کی کھائی ہے ضرور

کچھ کنسرٹ کے بارے میں:

جمعہ ۲۷ ستمبر ۶۰ء کی حسین شام کو ثقافت و موسیقی کے مرکز رائل فیسٹول ہال (لندن) میں روی شنکر اور ان کے طائفہ موسیقی نے اپنے فنی کمالات کو حسن و دلکشی سے پیش کیا۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے شرد کمار نے اپنے ساتھیوں مسکین خاں اور فقیر محمد خاں کی معیت میں شہنائی کے حسین بولوں سے سنگیت کے شیدائیوں کی جی بھر کر تواضع کی۔ شرد کمار مرزاپور کے رہنے والے ہیں اور فنی اعتبار سے ان کا مستقبل بڑا روشن نظر آتا ہے۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے ''ابتدائیہ'' ادا کیا۔ اناؤنسر کی حیثیت سے جب روی شنکر خود مائیک پر تشریف لائے تو ہال داد تحسین سے گونج اُٹھا انھوں نے مختصر طور پر اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ اور یوں پہلی آئٹم کا اعلان ویدی حمدوں سے ہوا۔ جتندر را ہیشکھی نے پرسوز اور گمبھیر آواز سے نہایت اچھا تاثر اور ماحول پیدا کر دیا۔ اس کے بعد شوکمار اور استاد اللہ رکھا سٹیج پر تشریف لائے۔ شوکمار ایک نوجوان کشمیری پنڈت ہیں جنھوں نے ۱۱۶ تاروں پر محیط ساز سنتور پر راگ راگیشری بجایا اور ایسی مہارت، نفاست اور چابک دستی سے دادِ فن دی جو انھیں سے مخصوص ہے۔ سنتور ساز اخروٹ کی بنی ہوئی دو چھوٹی چھڑیوں سے بجایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آواز دوسرے سازوں کی نسبت زیادہ پر درد اور جاں نواز ہے۔ اُس پر

ہونہار سنگیت کار کا تخیل مستزاد!!

گلوکاری کی باری آئی تو مشہور مغنیہ لکشمی شنکر نے کلاسیکی گائیکی کا آغاز راگ چندر کونس سے کیا۔ سارنگی پر سنگت مشہور سارنگی نواز استاد صابری نے کی۔ طبلہ اور تانپورہ بالترتیب شوکمار اور نودوسی ملک نے بجایا۔ لکشمی جی کی آواز میں وہ رچاؤ اور سوز ہے جو پٹیالہ گھرانے کا خاصا ہے۔ انہوں نے اپنے صوتی اظہار سے عجیب عجیب گل بوٹے پیدا کیے۔ صابری خاں نے سہ آتشہ سارنگی سے ان میں حسین و جمیل رنگ بھرے جو انہیں سے مختص ہے۔ غرض ساز و آواز کا یہ امتزاج ایک انوکھی چیز تھا۔ جو یورپین سامعین کے لیے اچھوتا اور مشرقی حضرات کے لیے خاطر خواہ تھا۔ استاد اللہ رکھا اور پلگھٹ رگھو کے درمیان طبلے اور مردنگم پر جگل بندی نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ انٹرول کے بعد خود پنڈت روی شنکر نے سولو راگ بھوگی کا ٹہڑا پیش کیا۔ جسے سن کر روی شنکر کے عظیم دکھوں کا پتہ چلتا ہے جو وہ دل و جان سے دوسروں کے لیے محسوس کرتے ہیں۔ گویا

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس کے بعد انہوں نے حسین راگ کھماج بجایا۔ طبلے پر سنگت استاد اللہ رکھا نے کی۔ سپردگی حسرت و یاس حرماں نصیبی اور جذبے کا عمق اس راگ کی خصوصیات تھیں کہیں کہیں شوخی و دلربائی کی تضمین سے اس کے حسن میں اور بھی نکھار پیدا کیا۔ خاص طور پر جبکہ واپسی پر پہلے مصرعے کی گردان اور اعادہ ہوتا تھا۔ چہرے پر کرب و یاس کے نقوش نے بھی راگ کی ادائیگی میں بے پناہ کشش اور ندرت پیدا کی۔ لے کے ٹکڑے کرتے وقت راگ کی تزئین و آرائش بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ خصوصاً جب وہ گر اور سم پر گرتے تھے۔ سر کو جھلانا نزاکت طبع کا آئینہ دار تھا جو روی شنکر کا ہی خاصا ہے۔ لے اور تال کے بعض خصوصی مقامات

کی وضاحت اپنے اندر کمال دلفریبی رکھتی تھی۔ پھر جب رہوارِ خیال نے طبلے پر سوار ہو کر زقندیں لگانا شروع کیں تو زماں و مکاں ٹھہر جانے کا گمان ہونے لگا۔ جب رقص کا توڑا استعمال کیا گیا تو سمندِ ناز بھی قابو سے باہر ہونے لگا۔ غرض دو جغادری استادوں نے راگ کھماج کے بندِ قبا بڑی نفاست اور قرینے سے کھولے۔ اس یادگار محفلِ موسیقی کا اختتام روی شنکر کے اپنے ترتیب دیے ہوئے ساز ینے ''دو بہار'' سے ہوا۔ جس میں تمام فنکاروں نے روی کی زیرِ نگرانی حصہ لیا۔ المختصر ان کلمات کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

رات کھوئی تھی جس سے میر نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

روی شنکر پردہ ساز:

روی شنکر نے یورپ اور امریکہ میں موسیقی کے متوالوں کے دلوں میں خاصا گھر کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نے ایشیائی سنگیت کو ایک خاص سمت اور طرز دی ہے۔ وہ صوت و آواز سے ایسے ایسے تجربات کرتا ہے جو مغربی کانوں کو نامانوس ہونے کے باوجود بھلے لگتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اس نے استاد سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اس کے بخشے ہوئے علم کو اپنی فطری صلاحیتوں سے نیا طریق اظہار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اور تو اور اس کے یورپین شاگرد بھی روایتی انداز سے تعظیماً اس کے پاؤں چھوتے ہیں۔ مثلاً مشہور بیٹل جارج ہیریسن اور دیگر شاگردوں کو راقم الحروف نے کئی بار ایسے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ عظیم ستار نواز اور نغمہ ساز بنارس میں ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوا۔ رقص و سرور کا خاندان میں دور دورہ تھا۔ بچپن سے ہی ایسے ماحول میں رہ کر ہونہار، روی نے سر لے کا ابتدائی رشتہ معلوم کر لیا ذرا بڑا ہوا تو اپنے بڑے بھائی اور بین الاقوامی شہرت کے رقاص

اودے شنکر کی ڈانس پارٹی میں شامل ہوگیا۔ جہاں اسے یورپ اور امریکہ میں ایک ڈانسر کی حیثیت سے دورہ کرنے کا موقع ملا۔ اور یہیں وہ مغربی موسیقی کے اصولوں سے واقف ہوا۔ بعد میں رقص کی تنگنائی کا اندازہ کرتے ہوئے ریاست میہر میں جا کر بابائے موسیقی استاد علاؤ الدین کی شاگردی اختیار کی جو گانے کے ساتھ ساتھ سازوں کا بھی عظیم نبض شناس ہے۔ آج بھی سو سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اس کے ہاتھوں میں وہ توانائی اور زندگی ہے جو بے جان تاروں کو قوتِ گویائی بخشتی ہے۔ اسی عظیم استاد کا فیضان ہے کہ مشہور گائیک گٹارسٹ بیٹل جارج ہندوستانی سنگیت میں اس کی شاگردی کا دم بھرتا ہے اور اس کی صداقت کی گواہی تو میں خود دے سکتا ہوں کہ شہرہ آفاق یہودی مینوہن نے West meets east کی ریکارڈنگ کے دوران روی شنکر کو مخاطب کر کے کہا ''روی! تم واپس جا کر یہ فخریہ کہہ سکو گے کہ یہودی جیسے وائلن نواز نے بھی تم سے کسب فیض کیا ہے۔''

تیرا سرمایہ یہی بات تو ہیں:

امریکی جریدہ ٹائم (شمارہ ۲۵ فروری ۱۹۶۶ء) مشہور عالم پیانو نواز آرتھر روبن سٹائن Artur Rubinstein کے متعلق رقم طراز ہے:

میوزک کی کنڈکٹر ایڈورڈ فان ری موٹلEdouard van Remoortel کا کہنا ہے ''صرف روبن سٹائن ہی ایسا پیانسٹ ہے جسے آپ آدھی رات کو جگا کر کہہ سکتے ہیں کہ پیانو کے ۳۸ میجر کنچر ٹوز38 Major Piano Concertos میں سے کوئی سا ایک بجا کر دکھا دے۔ وہ خود کہتا ہے ''جب میں پیانو بجاتا ہوں تو میرے ذہن کی گہرائیوں میں ایک کے بعد ایک صفحہ اُلٹتا جاتا ہے اور مجھے یہاں تک یاد ہوتا ہے کہ فلاں صفحے کے نیچے داہنے ہاتھ کے کونے میں کافی کا ایک چھوٹا سا دھبہ موجود ہے اور کسی دوسرے

صفحے پر میں نے Motto Vivace کے الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ آگے چل کر اس کا کہنا ہے ''ناشتہ کے وقت ہو سکتا ہے میرے ذہن میں براہمز Brahms کی سمفنی (Symphony) نغمہ سرا ہوتی ہے پھر مجھے کوئی فون کے لیے بلا لیتا ہے۔ آدھ گھنٹے کے بعد مجھے پتہ چلتا ہے کہ اس درمیانی وقفے میں موسیقی کا وہ ٹکڑا میرے ذہن میں اپنی تمام تر تنظیم کے ساتھ رواں دواں رہا ہے اور اب میں اس کے تیسرے تدریجی ارتقا (Third Movement) میں پہنچ گیا ہوں۔

ہماری موسیقی میں بھی ایک آرتھر روبن سٹائن موجود ہے۔ میری مراد اُستاد اللہ سے رکھا ہے ان کا ذہن اس قدر مربوط، منتظم اور موسیقی کا شیدائی واقع ہوا ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے کھاتے پیتے طبلے کے مشکل دادق تال، قاعدے اور ماترے ان کے ورد زبان ہوتے ہیں۔ وہ فلم دیکھ رہے ہیں تو زیرلب طبلے کے توڑوں کو پڑھ رہے ہوں گے۔ عین سم پر ان کا ہاتھ ران پر آ گرے گا اور پاؤں کی ضرب سے بھی اس کا اعلان ہوگا کہ آپ چونک پڑیں گے۔ موسیقی اور تناسب ضرب ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ طبلے کے بولوں کو ہر وقت یاد کرتے رہنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند کے بہترین طبلہ نواز اور مردنگ کے مشاق سازندے بھی طبلے کے اشکال میں ان کی رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں۔ لندن میں میرے سامنے کی بات ہے، خان صاحب نے ایک نجی محفل میں بالاسرسوتی (جنوبی ہند کی مشہور رقاصہ) کے ہمراہی مردنگ نواز کو ایک نیا، اچھوتا اور مشکل توڑا سنایا، وہ بڑا محظوظ اور متاثر ہوا۔ خاں صاحب نے بلا توقف اسی چیز کو حسابی قاعدے سے ایک اور نرالی شکل میں ترتیب دے کر سنایا تو وہ عش عش کر اُٹھا۔ غرض موسیقی اور آپ یک جان دو قالب کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

یہ نامور طبلہ نواز ۱۹۱۹ء کو پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوا۔ ۸ برس کی چھوٹی عمر

میں طبلہ از خود بجانا شروع کر دیا۔ لاہور تشریف لائے تو پکھاوٗ جی خاندان کے عظیم اُستاد قادر بخش سے طبلے کی تعلیم لینا شروع کی۔ اور یہ سلسلہ چار پانچ برس جاری رہا اور یوں پنجاب کے پکھاوٗ جی باج کی ابتدا طبلے پر بجا کر کی۔ خود خاں صاحب کا کہنا ہے جب تک یہ دونوں (طبلہ اور پکھاوج) نہیں ملیں گے اس وقت تک پرشکوہ اور بامزا طبلہ پیدا نہیں ہوگا۔ ان دونوں کا اختلاط از بس ضروری ہے۔ پنجاب کے مشہور گائیک استاد عاشق علی خاں سے گائیکی کی تعلیم بھی حاصل کی اس طرح ان دو بڑے گھرانوں نے آپ کے ذہن و وجدان کو صیقل کر کے کندن بنا دیا ہے۔

سر اور لے کا تعلق پوچھا تو فرمایا "یوں کہیے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے توام پیدا ہوئے ہیں۔"

apnaorg.com/books/urdu

اغلاط کی تصحیح

صفحہ 17 تال (ال) پنچم صفحہ 20: مطرب بہ نغمہ۔ صفحہ 21: کا سر نامہ ہونا چاہیے۔ (سالوں)۔
صفحہ 18: شہزاد احمد شہزاد صفحہ 19: آغا صادق
صفحہ 23: لے کر آئے (جو) خیال کا ــــــ ــ + صفحہ 38: جھنجھوٹی۔ وکیل حاضر باش
صفحہ 24: بہرے وحید خاں۔ صفحہ 26: لتا (بھی)۔ صفحہ 28: کوشش اور اس تک رسائی حاصل کرنا ہے
صفحہ 42: مزعفر۔ صفحہ 44: غنائیت۔ صفحہ 45: خیال انگ گائیکی
صفحہ 46: بقول (مقبول)۔ 1857ء کے بعد (57)۔
صفحہ 48: توان کا (توازن)۔ ہوا (ہو)۔ صفحہ 49: عبدالعزیز (عبد العزیز)
صفحہ 50: بدآہنگ آواز (کو) ایک نیا ــ + صفحہ 52: داد و دہش (،)
صفحہ 56: جھلیں۔ صفحہ 57: عصیان ما و رحمت پروردگار ما۔ درباری (بج رہے)
کا موڈ (متردد کیے ڈرے۔ مستند مبجر راگوں پر صفحہ 58: 13 ادا۔ ترچھی نجریا۔
روحانیات کی طرف سفر کرتی ہے۔
صفحہ 74: 1962 (1926)۔ احتراز۔ شکات (شکایت)
صفحہ 75: شالا وے پٹناں۔ جناں دل بیجاں۔ ماتک راؤ صفحہ 77: استفسارات
صفحہ 79: لے صفحہ 82: تیاری۔ صفحہ 88: جیتل۔ صفحہ 89: دو چند۔ صفحہ 92: حیرت
صفحہ 94: عبدالرحیم۔ ٹون تان۔ ملائم صفحہ 96: ٹھمری۔ ہوئی۔ مصرعوں۔ ملفوف
مطلق۔ پھرت۔ صفحہ 97: پردہ۔ ان کا۔ جس دلچسپ۔ صفحہ 98: ڈی
ٹی جوشی۔ اک وائی تال۔ اس رمز کا یہاں شنوا کون ہے بھلا۔ صفحہ 99: ان کے۔
آرائیجم۔ صفحہ 101 ان کے (ساتھ) استاد شکور خاں۔ صفحہ 102: دستگاہ
صفحہ 103: کھرج دار صفحہ 105: بجت۔ صفحہ 104 اقبال کا مصرع۔ جبین نیاز میں (ایک ہی لائین میں ہونا چاہیے)
صفحہ 106 رباعی کے بعد نیا ورق۔ صفحہ 107: شرما۔ صفحہ 108: شکریہ استی کا۔ صفحہ 110: موسیقی۔ صفحہ 111: رچاؤ
صفحہ 112: ولیکار۔ حدت۔ صفحہ 113: کشمیری۔ صفحہ 115: بلمل۔ صفحہ 116: ربابیاں۔
صفحہ 117: آنکھوں۔ دشت خرامی۔ دیپ۔ صفحہ 122: تالوں۔ بیٹی صفحہ 135: بھیروں
صفحہ 141: پنچم۔ صفحہ 143: زخمہ ور۔ صفحہ 144: لہرے نے۔ صفحہ 148: 17 ستمبر 1968ء۔
ورطۂ حیرت۔ صفحہ 149: زمان و مکاں۔ میوزک انڈ کلرز (ی)۔

محمد ایوب اولیا، ۱۶ نومبر ۱۹۳۸ء کو گوجرانوالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد شریف اولیا، اور والدہ کا نام آمنہ بیگم ہے۔ اُن کے دادا محمد حسین خاصے متمول اور ایک مکینیکل انجینئرنگ فرم کے مالک تھے۔ ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ سے، بی ایس سی فارمن کرسچین کالج لاہور سے، اکاؤنٹس اور کمپیوٹر سائنس کی تعلیم لندن سے حاصل کی۔ شاعری میں مولانا عبدالمجید سالک اور نثر میں مولانا غلام رسول مہر سے فیض حاصل کیا۔ انگریزی کے استاد مظفر علی سید اور اتالیق اردو ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ جن مشاہیر کی علمی اور ثقافتی محفلوں اور مجلسوں سے استفادہ کیا، ان میں مولوی عبدالحق، علامہ مشرقی، سید عابد علی عابد، فیض احمد فیض، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، احسان دانش، آغا صادق، چوہدری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) اور سردار عبدالرب نشتر کے نام شامل ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں عبدالرحمٰن چغتائی، اُستاد برکت علی، مختار بیگم، فریدہ خانم، استاد نزاکت سلامت علی خان، میڈم نور جہاں، مہدی حسن، اُستاد فتو خان، میاں قادر بخش، چھوٹے غلام علی خان، استاد اختر حسین اور روشن آرا بیگم سے ملاقاتیں رہیں۔

موصوف معروف طبلہ نواز استاد اللہ رکھا کے داماد اور استاد ذاکر حسین کے بہنوئی ہیں۔

ریاض ہانس

711، کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، پاکستان
+92-333-6414947، +92-321-7730040
riazhaans@gmail.com

ہندوستانی موسیقی کا 'فن کی دنیا' میں ایک قابلِ رشک مقام ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستان میں اس کی ایک اور خصوصیّت ہے کہ اس میں مذہبی تفریق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فن کا اپنا کعبہ ہے۔ فن کا اپنا کیلاش ہے۔ اس کے ماہرین ذاتی زندگی میں ہندو یا مسلمان ہیں لیکن فن کی دنیا میں اسی کعبے اور اسی کیلاش کے گرد طواف کرتے ہیں۔ میں چند استادوں سے واقف ہوں جو بہت ہی قابل احترام ہیں۔ موسیقی کے دلدادہ ان کی موسیقی سے واقف ہیں جو فردوس گوش بن کر آتی ہے لیکن ان کی زندگی ان کی جنت کی نظروں سے دور ہے۔

میرے نوجوان دوست ایوب اولیا نے جو موسیقی کے مزاج دان بھی ہیں اور نقاد بھی، اس جنت کے دروازے کھولنے کا سامان کیا ہے۔ 'سنگیت کار' کے نام سے انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے سنگیت کاروں اور موسیقاروں کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس کام کے لئے ان سے بہتر لکھنے والا تلاش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ ذاتی طور سے ان موسیقاروں کی زندگی سے آشنا ہیں اور انہیں بحیثیت انسان بھی جانتے ہیں۔

ہمارے پاس شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے ہیں۔ انہیں پڑھ کر ہم ان کی تخلیقات سے بہتر طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سنگیت کاروں کا یہ تذکرہ بھی یہی کام سرانجام دے گا۔

علی سردار جعفری

ایوب اولیاء صبر ایوبی رکھتے ہیں، صاحب کرامات بھی ہیں۔ میں نے ان کو کئی بار ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے دیکھا ہے۔ شعر و ادب سے تو ان کا تانکا بھڑا ہی ہوا ہے، سرنگیت اور موسیقی میں بھی ان کو دخل ہے۔ برسوں سے لندن میں ہیں۔ یہاں انہوں نے پوری ایک بساط بچھا رکھی ہے۔ لندن ایسا گہوارۂ مغرب و مشرق ہے کہ ایشیا اور یورپ کی طنابیں یہاں کھنچ گئی ہیں۔ ہر آنے جانے والا یہاں ستانے کو رُک جاتا ہے، اور اگر اردو والا ہے، ادیب و غیر ادیب یا شاعر، و غیر شاعر، اور اُن دنوں ایوب اولیاء نے کوئی محفل جما رکھی ہے تو وہ بھی ان کی مہمان نوازی سے بہرہ اندوز ہونے کی سعی کرتا ہے۔ شعر و ادب تو اب بس چلو بھر رہ گیا ہے، ایوب اولیاء کا سچا اور کھرا عشق سرنگیت اور موسیقی سے ہے۔ موسیقاروں اور فنکاروں کے وہ ایسے پارکھ ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ ہندو پاک کے جید سے جید اور نامی گرامی فنکاروں، گائیکوں اور سازندوں پر انہوں نے ایسے ایسے مضامین اور خاکے لکھ رکھے ہیں کہ ان کی معلومات اور دلسوزی پر رشک آتا ہے۔ یہ ان کی سرگرمی کا خاص میدان ہے۔ اس معاملے میں ان کا جمالیاتی ذوق نہایت بالیدہ اور رچا ہوا ہے۔

سنگیت کار کے تمام مضامین یادگار نوعیت کے ہیں۔ اس معاملے میں دور دور تک ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کے ذوق و شوق اور معلومات کو دیکھ کر شاہد دہلوی مرحوم کی یاد آتی ہے۔ اب ایسے معلومات آفریں مستند لکھنے والے کہاں۔ یہ تکیہ مدت سے سونا پڑا تھا۔ خدا بھلا کرے ایوب اولیاء کا کہ انہوں نے اس طرف توجہ دی ہے اور منزل بہ منزل کئی تاریخی شخصیات کے بارے میں معلومات محفوظ کر دی ہیں۔

دعا گو ہوں کہ خدا دوسروں کو بھی ان کی ہم پائی کی توفیق دے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ